كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿ص : ٢٩﴾

تفسیر سورۃ الحج

امین احسن اصلاحی

www.facebook.com/payamequran

پیامِ قرآن کی پیش کش

تفسیر سورہ الحج

امین احسن اصلاحی

پیامِ قرآن facebook.com/payamequran

(The Pilgrimage, The Hajj)

مدنیؔ |78 آیات

سورہ کا عمود اور زمانۂ نزول

یہ سورہ مکی دور کی ان آخری سورتوں میں سے ہے جب مسلمانوں نے قریش کے ظلم وستم سے تنگ آکر، دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ہجرت کا وقت بالکل قریب آچکا تھا۔ اس دور میں قریش کے لیے آخری انذار و تنبیہ کے ساتھ یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس میں ان کو خدا کے غضب سے ڈرایا گیا، توحید اور قیامت کی قطعیت نہایت مؤثر دلائل کے ساتھ واضح کی گئی اور حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور بیت اللہ کے مقصد تعمیر کی روشنی میں ان پر یہ حقیقت واضح کی گئی کہ اس گھر کی تولیت کے اصل حق دار مشرکین نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جن کو انھوں نے اسے محروم کر رکھا ہے ساور ان کو یہاں سے نکالنے کے لیے ان پر ہر قسم کے ظلم وستم ڈھا رہے ہیں۔ فتح مکہ کی طرف اشارہ تو پچھلی سورہ کی آیت 44 میں بھی گزر چکا ہے، اس سورہ میں اس اشارے نے بالکل قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں قریش کو غدار اور غاصب قرار دے کر ان کو اس گھر سے بے دخل کیے جانے کی دھمکی اور مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور قریش کو اس سے بے دخل کر کے سان کو اس کا امین و متولی بنائے گا۔

یہ سورہ مکی ہے: یہ سورہ اپنے مزاج و مطالب کے اعتبار سے مکی ہے۔ اس کی صرف چار آیات (41-38) ہجرت کے بعد کی ہیں جس میں مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ حج کے لیے جائیں اور کفار قریش ان کو بزور روکنے کی کوشش کریں تو ان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں تلوار اٹھائیں۔ اللہ ان کی مدد فرمائے گا۔ یہ بات چونکہ اوپر والی بات ہی کی وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے مصحف کی ترتیب میں ان آیات کو یہاں جگہ ملی تاکہ اس اجازت کی حکمت واضح ہو جائے کہ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کا یہ حق اس لیے حاصل ہے کہ قریش کا خانہ کعبہ پر تسلط بالکل غاصبانہ ہے۔ اس کی تولیت کے اصلی حق دار مسلمان ہیں نہ کہ قریش۔

انھی چند آیات کی بنا پر ہمارے مفسرین نے، اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے باب میں، اختلاف کیا ہے۔ لیکن کسی مکی سورہ میں چند مدنی آیتیں داخل ہو جانے سے، جب کہ ان آیات کی نوعیت بھی محض توضیحی آیات کی ہو، پوری سورہ کو مدنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بعض مدنی

آیات سورۂ مزمل میں بھی ہیں حالانکہ وہ بالاتفاق مکی ہے۔ ہم آگے ان آیات کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ ان کی حیثیت اجمال کے بعد تصریح کی ہے۔ ایک بات جو مکی زندگی کے آخری دور میں فرمائی گئی تھی جب مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کی تفصیل نازل ہوئی تو اجمال اور تفصیل دونوں کو ایک ساتھ رکھ دیا گیا۔ صاحب کشاف نے بھی اس سورہ کو، باستثنائے چند آیات، مکی ہی قرار دیا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(1-4) مخالفین قرآن کو انذار کہ خدا کی پکڑ اور قیامت کا عذاب بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔ بغیر کسی دلیل کے خدا کے شریک و شفیع گمان کر کے، قیامت سے بے پروا ہو بیٹھنا اور شیطان کی پیروی کرنا اپنی شامت کو دعوت دینا ہے۔ شیطان کا اصلی کام، جس کے لیے خدا نے اس کو مہلت دی ہے، ہدایت دینا نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے بلکہ یہ ہے کہ جو شامت زدہ لوگ اس کی پیروی کریں ان کو وہ سیدھے جہنم میں لے جا اتارے۔

(5-8) انسان کی خلقت اور زمین کے خشک و بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سر نو سرسبز و شاداب ہو جانے سے امکان معاد پر استدلال، یہ واضح کرنے کے لیے کہ جو لوگ قیامت کے باب میں شک میں پڑے ہوئے اور اس سے بے پروا ہیں، نہ خود اپنی خلقت کی نوعیت اور اس کی حکمتوں پر غور کر رہے ہیں اور نہ اس کائنات کے روزمرہ مشاہدات پر، وہ آنکھیں کھولیں اور مشاہدۂ عذاب کے مطالبہ کے بجائے آفاق و انفس کی نشانیوں سے سبق حاصل کریں۔ قیامت کا آنا خدا کی صفات کا ایک بدیہی اور لازمی تقاضا ہے۔ وہ لاریب آ کے رہے گی۔

(9-16) ان لوگوں کی تردید جو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر آخرت سے نچنت اور شرک کی حمایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و مباحثہ کے لیے ہر وقت آستینیں چڑھائے رہتے۔ اس امر کی وضاحت کہ شرک کے ساتھ خدا کی بندگی کا دعویٰ ایک بالکل لاطائل دعویٰ ہے۔ جو لوگ محض اپنی ظاہری منفعتوں ہی کے حد تک خدا کی بندگی اور اطاعت کرنا چاہتے ہیں، اس راہ میں کوئی امتحان پیش آ جائے تو وہیں سے وہ کترا جاتے ہیں اور دوسرے آستانوں پر جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں، خدا کے ہاں ایسے دو دلوں اور

منافقوں کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایسے لوگ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنی منفعتوں کی خاطر جن کی طرف بھاگتے ہیں ان کا ضرر ان کی منفعت سے قریب تر ہے۔ نافع وضار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر کوئی خدا سے مایوس ہوتا ہے تو وہ آسمان میں تھونی لگا کر اپنی سی کر کے دیکھ لے کہ اس کی کوئی بڑی سے بڑی تدبیر بھی اس مشکل کو حل کرنے والی بنتی ہے!

(17-24) مسلمانوں کو تسلی اور تمام مخالف اسلام فرقوں اور گروہوں کو آگاہی کہ ہر ایک کا رویہ خدا کی نظر میں ہے۔ کسی کا کوئی قول و فعل بھی اس سے مخفی نہیں۔ بالآخر ایک دن سب کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہو گا۔ ایک طرف وہ لوگ ہوں گے جو آج خدا کی وحدانیت اور اس کے کلمۂ حق کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنی بدعتوں سے خدا کے دین کو بگاڑا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ جو شرک و کفر کے مرتکب ہوئے ہوں گے ان سب کو جہنم میں داخل کرے گا اور جو توحید و ایمان پر قائم رہیں گے وہ جنت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔

(25-37) اصل ملت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کے مقصد تعمیر کی وضاحت تاکہ مشرکین مکہ اور ان کے حامی اہل کتاب پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ آج وہ اپنے آپ کو ملت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کا جو وارث و متولی سمجھے بیٹھے ہیں اور اس زعم میں خدا کے رسول اور اس کے ساتھیوں پر انھوں نے اس گھر کے دروازے بند کر رکھے ہیں، یہ محض ان کی برخود غلطی اور دھاندلی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو اس شرک و بت پرستی کے لیے نہیں بنایا تھا جس کا ایک گڑھ بنا کے اس کو رکھ دیا گیا ہے بلکہ انھوں نے اس کو صرف خدائے واحد کی عبادت اور اسی کے حج و طواف کا مرکز بنایا تھا۔ اسی ضمن میں قربانی اور دوسرے شعائر و مناسک کی اصل روح کی طرف توجہ دلائی گئی تاکہ وراثت ابراہیمی کے یہ مدعی اپنا جائزہ لیں کہ حضرت ابراہیمؑ کیا تعلیم دے گئے تھے اور انھوں نے ان کی تعلیم کو کس طرح مسخ کیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آج اللہ کے جو بندے ملت ابراہیمؑ کا احیاء کر رہے ہیں ان کو یہ اس گھر سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔

(38-41) یہ چار آیتیں مدنی ہیں۔ مسلمان، مدینہ سے ہجرت کر جانے کے بعد، جب ایک منظم جماعت بن گئے تب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر وہ حج کے لیے جائیں اور کفار روکیں تو ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ سوال اس وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اشہر حُرم اور خاص طور پر حدود حرم میں جنگ زمانۂ جاہلیت میں بھی حرام سمجھی جاتی تھی۔ قریش اشہر حُرم اور حرم کی اس حرمت کو اپنے لیے ایک سپر بنائے ہوئے تھے اور مسلمان بھی اس حرمت کے منافی کوئی اقدام کرنے کی جرأت اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہ ملے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دے دی کہ اگر اس طرح کی کسی جنگ کی نوبت

آئے تو تم بھی جنگ کرو۔ یہ جنگ اشہر حُرم یا حرم کی حرمت کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ بیت اللہ کی تطہیر کے لیے ایک مقدس جہاد ہے اور اگر تمھیں قوت حاصل ہو تو بیت اللہ کو اس کے غاصب قابضوں سے آزاد کرانا تمہارا فریضہ ہے۔ ساتھ ہی جہاد کی یہ حکمت بھی واضح فرمادی کہ اگر اس طرح کی جنگ بھی تقویٰ کے منافی سمجھی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ تمام مساجد، جو اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوئیں، کفار و شیاطین کے حوالے کر دی جائیں کہ وہ ان کو ڈھا کر رکھ دیں یا بت خانہ بناڈالیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو اس جنگ سے نہ ہچکچانا چاہیے، نہ مخالفوں کے طعنوں کی پروا کرنی چاہیے۔ اگر اس راہ میں جنگ پیش آئی تو، اان کی قلت تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود، خدائے قوی و عزیز ان کی مدد فرمائے گا تاکہ جب ان کو سرزمین حرم میں اقتدار حاصل ہو تو وہ اس کو شرک و کفر کی تمام نجاستوں سے پاک کر کے اس کے ان مقاصد کا احیاء کریں جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان کو آباد کیا تھا۔

تطہیر بیت اللہ کے لیے جہاد کی یہ اجازت چونکہ اسی بات کا ایک لازمی نتیجہ تھی جو اوپر والے پیرے میں بیان ہوئی کہ قریش کا اس گھر پر قبضہ غاصبانہ ہے، انھوں نے اس کے مقاصد برباد کر کے رکھ دیے ہیں، اس وجہ سے جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو گو یہ نازل مدینہ میں ہوئیں لیکن ترتیب میں ان کو جگہ یہاں دی گئی تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ صورت حال کے تقاضے سے یہ اجازت دی گئی۔

(42-52) تاریخ کی شہادت کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کی قوموں کو جو تہدید فرمائی وہ بالآخر پوری ہو کے رہی۔ کوئی قوم بھی اپنے رسول کی تکذیب کے بعد صفحۂ ارض پر قائم نہ رہ سکی۔ صرف ان کی عظیم عمارتوں کے کھنڈر باقی رہ گئے جو عبرت کے لیے کافی ہیں بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔ لیکن جن کے دل اندھے ہو چکے ہوں ان کا علاج کسی طبیب کے پاس بھی نہیں ہے۔ جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے ان کو جواب کہ خدا کی تقویم تمہاری تقویم سے مختلف ہے۔ اس کے ہاں کا ایک دن تمہارے ہزار سالوں کی طرح ہے تو جلدی نہ مچاؤ، خدا کی بات پوری ہو کے رہے گی۔ خدا نے جس طرح پچھلی قوموں کو مہلت دی اسی طرح تمھیں بھی مہلت دی ہے لیکن جس طرح ان پر عذاب آکر رہا اسی طرح تم پر بھی، اگر تم اپنی ہٹ سے باز نہ آئے، عذاب آکے رہے گا۔ رسول کا کام انذار و تبشیر ہے۔ عذاب کا فیصلہ خدا کے اختیار میں ہے۔

(53-57) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمہارے یہ مخالفین تمہاری دعوت کی مخالفت میں جو جھاڑ کے کانٹے کی طرح تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں، رسولوں کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر رسول کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے۔ جب کبھی کسی رسول یا نبی نے اصلاح احوال کی راہ میں کوئی حوصلہ کیا ہے شیاطین نے اسی طرح اس کے حوصلہ کی راہ مارنے کی کوشش کی ہے اور اس میں اڑنگے ڈالے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہمیشہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں کو مٹاتا اور اپنی باتوں کو غالب و فتح مند کرتا رہا ہے۔ شیاطین کو

اللہ نے وسوسہ اندازی و خاک بازی کی یہ مہلت اس لیے دی ہے کہ یہ چیز حق کے سچے حامیوں اور بوالہوسوں میں وجۂ امتیاز ہو۔ جو لوگ حق کے طالب ہوتے ہیں شیاطین کے پروپیگنڈے سے ان کا ایمان نکھرتا اور ان کا علم پختہ ہوتا ہے اور جو بوالہوس اور منافق ہوتے ہیں ان کی ضلالت پختہ سے پختہ ہو جاتی ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ ان کے اور اہل حق کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ جو اہل حق ہوں گے اس امتحان سے گزرنے کے بعد آخرت کی بادشاہی کے وارث ہوں گے اور اہل باطل جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

(58-64) جو لوگ اس دور میں ہجرت کر چکے تھے یا اس کے لیے پابرکاب تھے ان کو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی بشارت اور خدا کی صفات اور آفاق کی شہادت سے اس بشارت کی تائید کے دلائل۔

(65-70) کفار کی طرف سے مطالبۂ عذاب کے باوجود ان کو جو مہلت ملی ہوئی تھی اس کی حکمت کی طرف اشارہ کہ خدا رحمت کرنے میں جلدی کرتا ہے، قہر کرنے میں وہ بڑا دھیما ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ اب تم ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ خدا قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور یہ چیز خدا کے لیے نہایت آسان ہے۔

(71-76) شرک اور شفاعت باطل کے نظریہ پر آخری ضرب تاکہ مشرکین پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جن شرکاء و شفعاء کے اعتماد پر وہ آخرت سے بے پروا ہیں، وہ خدا کی عدالت میں ذرا بھی ان کے کام آنے والے نہیں ہیں۔

(77-78) خاتمۂ سورہ جس میں مسلمانوں کو بحیثیت جماعت خطاب کر کے خدا کی عبادت اور اس کی راہ میں جہاد کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ اب ملت ابراہیمؑ کے وارث تم ہو، خدا نے تم کو مسلم کے لقب سے ممتاز فرمایا اور اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ خدا کے رسول نے جس طرح تم پر حق کی گواہی دی اسی طرح تم خلق پر حق کی گواہی دینے والے بنو۔ نماز و زکوٰۃ کا اہتمام کرو، خدا پر جمے رہو۔ وہی تمہارا مولیٰ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے!!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ﴿١﴾

ترجمہ

اے لوگو! اپنے خداوند سے ڈرو بے شک قیامت کی ہلچل بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ' کا خطاب اگرچہ عام ہے لیکن مراد اس سے وہی متمردین قریش ہیں جو قیامت کی تکذیب کر رہے تھے اور عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ اپنے رب سے ڈرو، اس نے اپنی عنایت سے جو مہلت دے رکھی ہے اس کو غنیمت جانو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ وہ اپنی رحمت و رافت کے سبب سے دیر گیر ضرور ہے لیکن بڑا ہی سخت گیر بھی ہے۔ قیامت کو سہل چیز نہ سمجھو کہ اس ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کر رہے ہو۔ اس کی ہلچل بڑی ہی ہولناک ہو گی۔ وہ پناہ مانگنے کی چیز ہے، مطالبہ کرنے کی چیز نہیں ہے!

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ﴿٢﴾

ترجمہ

جس دن تم اسے دیکھو گے اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہے ہی بڑی ہولناک چیز!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

قیامت کی ہولناکی کی تصویر: یہ اس دن کی ہولناکی کی تصویر ہے کہ وہ دن ایسی نفسی نفسی کا ہو گا کہ کسی کے اعوان و انصار اور اس کے اخوان و اقرباء اس کے ذرا کام نہ آئیں گے۔ اس دن مرضعہ، جس کو اپنا بچہ جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، اپنے بچے کو بھول جائے گی اور حاملہ دہشت کے سبب سے اپنا حمل ڈال دے گی۔ لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ بالکل مدہوش اور متوالے ہو رہے ہوں گے۔ لیکن یہ مدہوشی شراب کے نشہ کی نہیں ہو گی بلکہ عذاب الٰہی کی ہولناکی سب کو پاگل بنا کے رکھ دے گی!

آیت میں ایک ہی ساتھ مخاطب کے لیے جمع اور واحد دونوں کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جمع کے لیے جب واحد کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور اس میں جمع کے بالمقابل زیادہ زور ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ ﴿٣﴾

ترجمہ:

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی علم کے خدا کی توحید کے باب میں کٹ حجتی کرتے اور ہر سرکش شیطان خبیث کی پیروی کرتے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

ایک خاص اسلوب بیان: 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ' کے اسلوب بیان میں جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس سے مقصود عام میں سے خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اگر موقع و محل تحسین کا ہو تو یہ اسلوب تحسین کے لیے بھی آتا ہے اور اگر موقع و محل تقبیح کا ہو، جیسا کہ یہاں ہے، تو اس سے تقبیح کی شدت نمایاں ہو گی۔ اگر اس اسلوب کو اپنی زبان میں ادا کرنا چاہیں گے تو کہیں گے کہ لوگوں میں ایسے جاہل، احمق اور بدھو بھی ہیں جو یوں کہتے یا یوں کرتے ہیں۔ یہ خاص طور پر اس گروہ کا ذکر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، خاص طور پر توحید کی مخالفت میں، ہر وقت مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھائے رہتا تھا۔ اس طرح کے لوگ کسی معاشرہ میں بھی تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کا ایک خاص طائفہ ہی ہوتا ہے۔ ان کا علم بھی بس سنی سنائی اور رٹی رٹائی باتوں پر مبنی ہوتا ہے لیکن زبان

درازی میں طاق اور لاف زنی میں مشاق ہوتے ہیں اس وجہ سے شاطر لوگوں کے ایجنٹ بن کر بے چارے سادہ لوح عوانم کو گمراہ کرنے کی خدمت خوب انجام دیتے ہیں۔

مجادلہ بغیر علم کے: 'یُجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ'۔ 'فِی اللّٰہِ' سے مراد فی توحید اللہ ہے اس لیے کہ کفار عرب خدا کے منکر نہیں تھے۔ وہ صرف خدا کی توحید کے منکر تھے اور توحید کے انکار کے لیے ان کے پاس دین آباء کی اندھی تقلید کے سوا کوئی دلیل نہیں تھی۔ آگے آیت 8 میں وضاحت آئے گی کہ ان کے پاس اللہ کے دین کا کوئی علم تھا، نہ عقلی و فطرت کی کوئی ہدایت، نہ کوئی قرآن و کتاب، بس یونہی، بغیر کسی دلیل اور علم کے، خدا کی توحید کے بارے میں مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ پیشہ ور مناظروں کے پاس زبان درازی کے سوا اور کوئی علم نہیں ہوتا، یہ صرف اپنے ضال و مضل لیڈروں سے الہام حاصل کرتے ہیں اور گلی گلی میں ان کا ڈھول پیٹتے پھرتے ہیں۔

شیطان سے مراد شیاطین جن وانس، دونوں ہیں: 'وَ یَتَّبِعُ کُلَّ شَیۡطٰنٍ مَّرِیۡدٍ'۔ 'شیطان' سے مراد شیاطین جن وانس دونوں ہیں۔ لفظ 'کل' اس مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں میں بڑا گہرا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ شیاطین جن، شیاطین انس ہی کو اپنی فتنہ انگیزیوں کا ذریعہ بناتے ہیں۔ شیاطین جن القا کرتے ہیں اور شیاطین انس ان کے القا کو مختلف ناموں سے ایک فلسفہ بناتے اور پھر اولاد آدمؑ کو گمراہ کرنے کے لیے اس کو تمام ذرائع سے پھیلاتے ہیں۔ قرآن نے اس طرح کے تمام ائمۂ ضلالت کے لیے شیطان ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

'مَرِیۡدٌ' کے معنی: 'مَرِیۡدٌ' کے معنی شریر و خبیث اور متعری عن الخیر یعنی لاخیرے کے ہیں۔

'شَیٰطِیۡنُ' خواہ شیاطین جن ہوں یا شیاطین انس، ظاہر تو ہوتے ہیں ہمیشہ خیر خواہ، ناصح، ہمدرد اور بہی خواہ قوم و وطن کے بھیس میں لیکن درحقیقت وہ نہایت ہی خبیث و شریر اور بالکل لاخیرے ہوتے ہیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹا کر اپنی ڈگر پر ڈال دیتے ہیں اور جو لوگ ان کے نقیب و چاؤش بن کر ان کے فتنوں کے پھیلانے میں ان کے آلۂ کار بن جاتے ہیں ان کو اپنے سمیت جہنم کا فرزند بنا دیتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی توحید کے بارے میں ہمارے پیغمبرؐ سے مباحثے اور مناظرے کر رہے ہیں وہ ایسے ہی خبیث اور لاخیرے شیطانوں کے پیرو ہیں۔

قیامت کے ذکر کے ساتھ توحید کے ذکر کی حکمت: قیامت کے ذکر کے ساتھ یہ معاً توحید کا ذکر اس لیے ہے کہ درحقیقت قیامت کی ساری اہمیت توحید کے ساتھ ہی ہے۔ اگر خدا کے ساتھ اس کے شرکاء و شفعاء کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو قیامت کی ساری اہمیت ختم ہو

جاتی ہے۔ اگر کوئی روز عدالت ہے تو اس سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے اگر ایسے شرکاء و شفعاء موجود ہیں جو اپنے زور و اثر یا سعی و سفارش سے اپنے نام لیواؤں کو خدا کی پکڑ سے بچا سکتے ہیں! اسی وجہ سے قرآن میں قیامت اور رد شرک دونوں مضمون ہمیشہ ساتھ ساتھ بیان ہوتے ہیں تا کہ لوگوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی جائے کہ خدا کی پکڑ سے کوئی بھی کسی کو بچانے والا نہیں بن سکے گا۔ سب کا معاملہ اسی کے حضور میں پیش ہو گا اور وہی تنہا ہر ایک کا فیصلہ فرمائے گا۔

كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَن تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿٤﴾

ترجمہ

جس کی یہ ڈیوٹی ہی مقرر ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا وہ اس کو گمراہ کر کے رہے گا اور اس کی رہنمائی وہ عذاب دوزخ کی طرف کرے گا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

شیطان کی ڈیوٹی: قرآن میں جگہ جگہ یہ بات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ شیطان نے قیامت تک کے لیے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت لی ہے اور اللہ نے اس کو یہ مہلت دی ہے کہ جا، جو تجھے اپنا دوست، مددگار اور رہنما بنائیں ان کو گمراہ کر لے، میں ان کو اور تجھ کو سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔ اسی حقیقت کو یہاں 'كُتِبَ عَلَيْهِ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ شیطان کی خدا کی طرف سے ایک مقررہ ڈیوٹی ہے کہ جو اس کو دوست بنائیں ان کو وہ گمراہ اور جہنم کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ 'فَأَنَّهُ' کا عطف 'أَنَّهُ' پر ہے اور 'مَن تَوَلَّاهُ' بطور بیان شرط کے ہے یعنی شیطان کا یہ فریضہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے اور ان کو جہنم کی راہ دکھائے بایں شرط مشروط ہے کہ جو لوگ اس کو اپنا ولی و کارساز بنائیں گے صرف وہی اس کے دام میں شکار ہوں گے۔ خدا کے ان بندوں پر اس کا کوئی زور نہیں چلے گا جو اس کو اپنا دشمن سمجھیں گیا اور ہمیشہ اس کے فتنوں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ زہر کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہلاک کرے، احمق ہیں وہ جو اس کو تریاق سمجھیں اور نگل لیں۔ شیطان کو خدا نے جو مہلت دی ہے وہ لوگوں کے امتحان کے لیے دی ہے اس کو لیڈر بنانے اور اس سے الہام حاصل کرنے یا اس کی پیروی کے لیے نہیں دی ہے۔

آگے کا مضمون ——— آیات ۵ - ۲۴

آگے قیامت اور توحید کے اسی مضمون کو جو تمہید کی آیات میں بیان ہوا ، ایک نئے رنگ سے لیا اور انسان کی خلقت کی نوعیت، اس کائنات کے مشاہدات، اور ان مشاہدات سے اس کائنات کے خالق کی جو صفات ہر عاقل کے سامنے آتی ہیں، ان سے قیامت اور توحید پر دلیل قائم کی ہےاور یہ دکھایا ہے کہ اگر انسان غور کرے تو قیامت اور توحید کے دلائل خود اس کے اپنے وجود اور اس کے اپنے ہی گرد و پیش میں موجود ہیں۔اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔احمق ہیں وہ جو ایسے بدیہی حقائق کا انکار اور ان کے بارے حجتیں کرتے ہیں۔اسی ضمن مین ان لوگوں کو بھی لیا ، جو خدا کی بندگی اپنی شرائط پر کرنا چاہتے ہین۔جہاں تک ان کے زعم کے خدا کے احکام نا کی خواہشوں کے مطابق ہوں وہاں تک تو وہ خدا کی بندگی پر راضی تھے ، لیکن دین کی جن باتوں کو وہ اپنی خواہشوں اور اپنے مصالح کے کلاف سمجھتے ، ان سے وہ گریز کرتے۔اسی طرح کے دع دلون اور منافقوں کا ایک گروہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر اس دور میں پیدا ہوگیا تھا جو خدا اور شیطان ، کفر ور اسلام دونوں کو جمع کرنے کا خواہشمند تھا۔اگرچہ اس گروہ کا رویہ کھلے ہوئے معاندین کے مقابل مین بظاہر روادارانہ تھالیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ رویہ بھی شرک بلکہ نہایت گھناؤنا شرک ہے۔اس وجہ سے قرآن نے یہاں اس پر بھی ضرب لگائی کہ اس دو رخی پالیسی کی خدا کے دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔جو لوگ نفع و ضرر دونوں خدا کے ہاتھ میں نہیں مانتےاور نرم گرم ہر طرح کے حالات میں خدا ہی کی بندگی نہیں کرنا چاہتے وہ اپنی پسندیدہ روش اختیار کریں لیکن یاد رکھیں کہ ان کی کوئی بڑی سے بڑی تدبیر ، خدا کی مرضی کے بدوں، ان کے کام آنے والی نہیں بن سکتی۔آخر میں اس کشمکشِ حق و باطل کے دونوں فریق۔اہلِ ایمان اور حامیانِ کفر و شرک۔۔۔۔کے انجام کا ذکر فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے جس مین فریقین کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا اور دونوں اپنے اپنے عقیدہ اور عمل کے مطابق سزا یا انعام پائیں گے۔اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ﴿٥﴾

ترجمہ

اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے باب میں شبہ میں ہو تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر منی کے ایک قطرے سے، پھر ایک جنین سے، پھر ایک لوتھڑے سے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص۔ ایسا ہم نے اس لیے کیا تاکہ تم پر اپنی قدرت و حکمت اچھی طرح واضح کر دیں اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدت معین کے لیے۔ پھر ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں، پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچتے ہیں تا آنکہ سوہ کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔ اور تم زمین کو بالکل خشک دیکھتے ہو تو جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہریں لینے لگتی اور ابھرتی ہے اور طرح طرح کی خوش نما چیزیں اگاتی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

قیامت کا مشاہدہ اپنے اندر اور باہر: 'فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ' قیامت کے باب میں مشرکین عرب کی روش صریح انکار کی نہیں بلکہ شک اور تردد ہی کی تھی۔ وہ اس کو ایک بہت ہی بعید چیز خیال کرتے تھے اور اس استبعاد کی بڑی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ مر کھپ جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا ان کے خیال میں بہت بعید از قیاس بات تھی۔ اپنے اس واہمہ کے سبب سے اول تو قیامت کو وہ کوئی اہمیت دیتے ہی نہیں تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی تھے تو ان کو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر یہ اعتماد تھا کہ وہ اپنی سفارش سے ان کو خدا کی بازپرس سے بچا لیں گے۔ قرآن نے قیامت کا جب اس شد و مد سے ذکر کیا کہ وہی اس زندگی اور اس کائنات کی اصل غائت قرار پا گئی اور ساتھ ہی ان کے تمام شرکاء و شفعاء کو بھی بے حقیقت ثابت کر دیا تو یہ چیز ان پر بہت شاق گزری۔ انھیں محسوس ہوا

کہ ان کی ساری عمارت بالکل ریت پر ہے۔ اس کو بچانے کے لیے ان کے پاس واحد حربہ صرف یہ رہ گیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر قیامت ایسی ہی یقینی چیز ہے تو وہ اس کو دکھا دیں یا اس کی کوئی ایسی محسوس نشانی 'بشکل عذاب' دکھائیں جس کے بعد وقوع قیامت میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ قرآن نے ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ان کو خود ان کے اپنے وجود اور اس دنیا میں روزمرہ کے مشاہدات کی طرف توجہ دلائی کہ قیامت اور توحید کی دلیل ڈھونڈھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خدا نے انسان اور اس کائنات کو بنایا ہی اس طرح ہے کہ جو شخص آنکھیں رکھتا ہے وہ اپنے اندر اور باہر ہر وقت خدا اور قیامت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

'عَلَقَة' کے معنی: 'فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ'۔ 'عَلَقَةٌ' خون کی پھٹکی کو بھی کہتے ہیں اور چھوٹے جاندار کیڑے کو بھی۔ یہ نطفہ کے قرار پا جانے کے بعد کا درجہ ہے جب وہ خون اور ایک جنین کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے اندر زندگی کی نمود پیدا ہو جاتی ہے۔

'مُضْغَةٌ' کے معنی: 'مُضْغَةٌ' گوشت کے لوتھڑے کو کہتے ہیں۔ یہ 'عَلَقَة' کے بعد کا مرحلہ ہے جب جنین گوشت کے ایک لوتھڑے کی شکل میں ایک جسم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس 'مُضْغَةٌ' کی بابت فرمایا کہ ان میں سے بعض کا ڈیزائن بالکل مکمل ہوتا ہے اور بعض کو قدرت نامکمل ہی چھوڑ دیتی ہے اور کسی کے بس میں بھی یہ نہیں ہے کہ اس کو مکمل کر دے۔

انسان کی اپنی خلقت ایک درس گاہ ہے: 'لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ' یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسان کی خلقت کے ان تمام مراحل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا انسان کو وجود میں لانے کے لیے ان تمام مراحل اور اس سارے اہتمام کا محتاج نہیں تھا کہ پانی کی ایک بوند کسی مادہ کے رحم میں قرار پکڑے، پھر وہ خون اور جنین کی صورت اختیار کرے اور قدرت اپنے ڈیزائن کے مطابق اس کی نقاشی و مصوری کر کے ساس کو حسین پیکر بنائے۔ اس تمام اہتمام و انتظام کے بغیر اگر خدا چاہتا تو بنے بنائے آدمی کسی دریا یا پہاڑ سے جھنڈ کے جھنڈ اور ریوڑ کے ریوڑ برآمد ہو جایا کرتے لیکن خدا نے یہ چاہا کہ انسان کی خود اپنی خلقت اس کے لیے خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی ایک درس گاہ بن جائے۔ جس میں وہ اپنے اور اس کائنات کے احسن الخالقین کی معرفت حاصل کرے۔ اس کا خود اپنا وجود اس پر شہادت دے کہ جس نے اس اہتمام و عنایت کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اس نے اس کو محض ایک کھلونا نہیں بنایا ہے بلکہ اس کی خلقت کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے، جو لازماً ظہور میں آ کے رہے گی۔ اس کے اپنے ہر بُنِ مُو سے اس کو یہ گواہی ملے کہ

خالق نے اس کو مٹی کے خلاصہ اور پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا اور اس کو اس میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی تو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا بھی اس کے لیے نہایت آسان ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ مومنون میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۵ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۵ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۵ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۵ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (12:23-16)

”اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک قرار کی جگہ میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو جنین کی شکل دی، پھر جنین کو ایک لوتھڑا بنایا، پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف مخلوق کی شکل میں متشکّل کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا! پھر اس کے بعد تم لازماً مروگے، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔“

سورۂ مومنون کی اس آیت میں وہ خلاصہ بھی سامنے رکھ دیا ہے جس پر انسان کی خلقت کے یہ تمام مراحل شہادت دے رہے ہیں لیکن ہمارے دورِ حاضر کے فلسفیوں اور سائنسدانوں کا یہ عجیب اندھا پن ہے کہ انھیں انسان کی خلقت کے یہ تمام مراحل و مدارج تو نظر آتے ہیں لیکن اس اصل حقیقت تک ان کی نظر نہیں پہنچتی جس کو واضح کرنے ہی کے لیے خدا نے یہ سارا اہتمام فرمایا۔

'وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا'۔ ابھی اصل سلسلۂ کلام پورا نہیں ہوا تھا کہ بیچ میں 'لِنُبَيِّنَ لَكُمْ' کا ٹکڑا اچانک مخاطبوں کو جھنجھوڑنے کے لیے آ گیا تھا کہ بلادت کے سبب سے وہ سو نہ رہے ہوں۔ ان کو جھنجھوڑنے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام کو لے لیا۔ فرمایا کہ اس کے بعد ایک مدت تک اس کو رحم میں ہم ٹھہراتے ہیں کہ وہ ایک پورے بچے کی شکل اختیار کر لے۔ 'مَا نَشَآءُ' یعنی یہ کلیۃً ہماری مشیت پر منحصر ہے کہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، خوب صورت ہو یا بد صورت، ناقص ہو یا کامل، کسی دوسرے کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ لڑکی کو لڑکا بنا دے یا بد صورت کو خوب صورت 'اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى' یعنی اسی طرح وضع حمل کے لیے ہم نے ایک مدت ٹھہرا دی ہے اور یہ چیز بھی کلیۃً ہمارے ہی اختیار میں ہے، کسی کے بس میں نہیں ہے کہ ہماری مقرر کی ہوئی مدت میں کوئی تغیر و تبدل کر دے۔

حذف کا ایک قرینہ: 'ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ' یہاں 'ل' اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے پہلے فعل محذوف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور سورۂ مومن آیت 67 میں بھی اس کی نہایت واضح مثال آئے گی۔ یعنی بچہ کی شکل میں تمہیں وجود بخشنے کے بعد ہم

تمھیں ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی اور پختگی کو پہنچو اور یہ قانون بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ وہ بچپن اور مراہقہ کے مراحل کو لانگ کر جوانی کے حدود میں قدم رکھ دے۔

'وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّتَوَفّٰى وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ' یہاں تقابل کے اصول پر، بربنائے وضاحت قرینہ، پہلے ٹکڑے میں '**فی صباہ او فی شبابہٖ**' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں اور دوسرے ٹکڑے میں 'ارذل العمر' کے الفاظ اس حذف کو واضح کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کتنے تو اپنے بچپن یا جوانی ہی میں مر جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جو بڑھاپے کی آخری منزل تک پہنچتے ہیں اور یہ امر بھی کلیۃً خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص اپنی مدت حیات میں نہ کمی کر سکتا ہے نہ بیشی۔

'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں: 'لِكَيۡلَا يَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَيۡـًٔا' 'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا ترجمہ 'یہاں تک' یا 'تا آنکہ' ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ 'علم' کی تنکیر تحقیر کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور تفخیم کے لیے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ ایسی ارذل عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ تھوڑا بہت علم جو اس کو حاصل ہوا ہوتا ہے وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ وہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ بھی نہیں جانتا، ہر چیز اس کے حافظہ سے محو ہو جاتی ہے۔ ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا ہے: 'اِنۡ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا' (تمھیں تو بس تھوڑا ہی علم عطا ہوا ہے)۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان چاہے سقراط و بقراط ہی کیوں نہ بن جائے لیکن علم کے بحر بیکراں کا ایک قطرہ ہی ہے جس کا وہ حامل بنتا ہے۔ اس سے زیادہ کے لیے وہ اپنے اندر ظرف ہی نہیں رکھتا۔ اور اس علم کا بھی حال یہ ہے کہ عمر کے ایک خاص حصہ میں وہ سب سلب ہو جاتا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اپنے علم پر بھی کسی کو غرہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی خدا ہی کی دین ہے، وہی بخشتا ہے اور وہ جب چاہے اس کو چھین سکتا ہے۔

ایک نظر عالم خارج پر: 'وَتَرَى الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ'۔ انسان کی خلقت کے اندر قیامت کے جو دلائل ہیں ان کی طرف توجہ دلانے کے بعد اس کو باہر کی دنیا کی طرف توجہ دلائی کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے۔ پھر جب اس پر بارش ہوتی ہے تو وہ نرم و گداز ہو جاتی اور نوع بنوع خوشنما نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس زمین کو بار بار مرتے اور جیتے دیکھتے ہو تو آخر اسی زمین سے اپنے ہی دوبارہ جی اٹھنے کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہو! ہر فصل و موسم میں یہ ریہرسل تو تمہارے سامنے تو اسی غرض سے ہو رہا ہے کہ قیامت کا مشاہدہ اس کے ہونے سے پہلے ہی

تمہیں ہوتا رہے۔ 'لِنُبَيِّنَ لَكُمْ' کے الفاظ یہاں مقدر ہیں۔ چونکہ یہ نشانی بالکل واضح تھی اس وجہ سے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾

ترجمہ

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ ہی پروردگار حقیقی ہے۔ اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

خلاصۂ بحث: شروع سورہ سے لے کر یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ان آیات میں اس کا خلاصہ سامنے رکھ دیا۔ یعنی خدا اور قیامت سے تمہیں ڈرتے رہنے کی یہ ہدایت جو کی جارہی ہے اس لیے کی جارہی ہے کہ معبود حقیقی صرف خدا ہی ہے، اس کے ماسوا جو تم نے اس کے شریک و سہیم بنارکھے ہیں، اور ان کے بل پر تم خدا اور آخرت سے نچنت ہوئے بیٹھے ہو، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض تمہارے وہم کی ایجاد ہیں 'وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰي' یعنی اوپر جو دلائل مذکور ہوئے ان سے یہ بات ثابت ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے اس لیے جب وہ چاہے گا تمہیں اٹھا کھڑا کرے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو پانی کے ایک قطرے کو عاقل و بالغ انسان بنا دیتا اور زمین کو اس کے خشک اور چٹیل ہو جانے کے بعد باغ و بہار کر دیتا ہے، اس کے لیے دنیا کو از سر نو زندہ کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا!

وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ﴿٧﴾

ترجمہ

اور قیامت آ کے رہے گی، اس کے آنے میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ ان سب کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

خلاصۂ بحث: شروع سورہ سے لے کر یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ان آیات میں اس کا خلاصہ سامنے رکھ دیا۔ یعنی خدا اور قیامت سے تمہیں ڈرتے رہنے کی یہ ہدایت جو کی جا رہی ہے اس لیے کی جا رہی ہے کہ معبود حقیقی صرف خدا ہی ہے، اس کے ماسوا جو تم نے اس کے شریک و سہیم بنا رکھے ہیں، اور ان کے بل پر تم خدا اور آخرت سے نچنت ہوئے بیٹھے ہو، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض تمہارے وہم کی ایجاد ہیں 'وَاَنَّہٗ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی' یعنی اوپر جو دلائل مذکور ہوئے ان سے یہ بات ثابت ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے اس لیے جب وہ چاہے گا تمہیں اٹھا کھڑا کرے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو پانی کے ایک قطرے کو عاقل و بالغ انسان بنا دیتا اور زمین کو اس کے خشک اور چٹیل ہو جانے کے بعد باغ و بہار کر دیتا ہے، اس کے لیے دنیا کو از سر نو زندہ کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا!

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ﴿٨﴾

ترجمہ

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے جھگڑا کرتے ہیں، بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

بے دلیل مجادلہ کبر ہے: آیت 3 میں جن مجادلین کی طرف اشارہ فرمایا تھا یہ ان کے رویہ کی تفصیل ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ خدا کے بارے میں مشرکین کی اصلی مخاصمت عقیدۂ توحید سے تھی۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو وہ بلا بحث و نزاع مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس کے بہت سے دوسرے شریک بھی ٹھہرا لیے تھے جن کو ثابت کرنے کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہوتی تھی لیکن ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ بس زیادہ سے زیادہ جو چیز وہ پیش کرتے وہ یہ کہ ہمارے باپ دادا ان معبودوں کو پوجتے آئے ہیں اس لیے ہم ان کو پوجتے رہیں گے اور ان کی توہین کسی حال میں برداشت نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جب بحث کا تعلق دلیل کے بجائے مجرد آباء واجداد کی اندھی تقلید سے رہ جائے تو یہ کبر و غرور ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد آدمی کے سامنے ساری منطق بے کار ہو کے رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس بے دلیل مجادلہ کو کبر قرار دیا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُجَادِلُوۡنَ فِيۡۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰٮهُمۡ‌ۙ اِنۡ فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ اِلَّا كِبۡرٌ مَّا هُمۡ بِبَالِغِيۡهِ (مومن : 56)

”بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بغیر کسی دلیل کے، جو ان کے پاس آئی ہو، کٹ حجتی کرتے ہیں، ان کے دلوں میں صرف غرور ہے جس میں ان کو کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے۔“

دوسرے مقام میں یہ حقیقت بھی واضح فرمادی ہے کہ اس سارے مجادلے کی محرک طریقۂ آباء کی اندھی عصبیت ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ٥ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا (لقمان :21-20)

”اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی رہنما کتاب کے جھگڑتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو کہتے ہیں ہم اسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔“

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٩﴾

ترجمہ

تکبر سے اینٹھتے ہوئے، حجتیں کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے برگشتہ کریں۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ہم قیامت کے دن ان کو آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

’ثَانِيَ عِطْفِهٖ‘ ان کے کبر و غرور کی تصویر ہے۔ جب کوئی شخص غرور کے ساتھ کسی سے اپنا رخ موڑتا ہے تو شانے جھٹک کر موڑتا ہے۔ آدمی کے پاس دلیل نہ ہو اور وہ اپنے غلط موقف سے دستبردار ہونے کے لیے بھی تیار نہ ہو تو اس کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی ہے اور اس کا انتقام وہ اپنے غرور کا مظاہرہ کر کے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ ’لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ‘ یعنی یہ سارا طنطنہ اور یہ ساری حمیت کسی حق کی حمایت کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے ہے کہ جس طرح وہ خود خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے دوسروں کو بھی اسی طرح بھٹکا دے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدمی کا خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہونا، اگر اس کو اپنی کمزوریوں کا احساس ہو، اس سے مایوس کر دینے والی چیز نہیں ہے، حق کی طرف اس کی بازگشت کا امکان ہے، لیکن جو شخص اپنے باطل کے حق میں اپنے پاس کوئی دلیل نہ رکھتے ہوئے بھی اس کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے، پوری رعونت کے ساتھ، اٹھ کھڑا ہو تو اس سے پھر کسی امید خیر کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

استکبار کی سزا دنیا اور آخرت کی رسوائی: 'لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ'۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب نار ہے۔ رسوائی اس لیے کہ انھوں نے حق کے مقابل میں استکبار کا مظاہرہ کیا اس وجہ سے وہ مستحق ہیں کہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث رسول کے مخالفین ہیں۔ رسولوں کے مخالفین کے باب میں سنت الٰہی، جیسا کہ ہم متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، یہی ہے کہ اگر وہ حق کی مخالفت پر جمے رہ جاتے ہیں تو، اتمام حجت کے بعد، لازماً وہ اس دنیا میں بھی شکست اور ذلت سے دوچار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی جہنم کے سزاوار ٹھہریں گے۔

'عَذَابَ الْحَرِيْقِ'۔ میں بھی عمل اور جزا کی مشابہت کا پہلو موجود ہے۔ یعنی چونکہ وہ اس دنیا میں حق کے خلاف غصہ، نفرت اور حسد سے جلتے اور کھولتے رہے اس وجہ سے وہ مستحق ہیں کہ آخرت میں جلنے کے عذاب کا مزا چکھیں۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَأَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿١٠﴾

ترجمہ

کہ یہ ہے تیرے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

زبان حال کی شہادت: ہم قرآن کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ کرتے آئے ہیں کہ جہاں مقصود صورت حال کی تعبیر ہو وہاں بالعموم 'قیل' اور 'یقال' وغیرہ حذف کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ یعنی زبان حال خود ان پر گواہی دے گی کہ یہ تمہاری اپنی ہی بوئی ہوئی بس بھری فصل کا حاصل ہے جو تمہارے سامنے آیا ہے، خدا نے تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔ جو بوئے گا وہی کاٹے گا: 'وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ'۔ اس اسلوب کی وضاحت بھی متعدد جگہ ہو چکی ہے کہ جب مبالغہ پر نفی آئے تو اس سے مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے 'لَيْسَ بِظَلَّامٍ' کے معنی ہوں گے اللہ تعالیٰ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

آیت کا مقصود یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں جو بوئے گا اسی کی فصل آخرت میں کاٹے گا۔ اگر اس نے استکبار کی کاشت کی ہے تو استکبار کا حاصل رسوائی ہے، وہ رسوائی کی فصل کاٹے گا۔ اور اگر حق کے خلاف غصہ اور نفرت کی پرورش اس نے کی ہے تو اس کا حاصل جلنے کا عذاب ہے وہ اس سے دوچار ہو گا۔ غرض جو کچھ اس نے کیا ہو گا وہی اللہ تعالیٰ اس کے سامنے رکھ دے گا۔ سرمو اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو گی!

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿١١﴾

ترجمہ

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچا تب تو ان کا دل خدا پر جمتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو اوندھے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔ کھلا ہوا خسارہ در حقیقت یہی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مذبذبین کا کردار: ان کٹر مشرکین کا ذکر کرنے کے بعد، جو شرک کی حمایت میں لڑائی ٹھانے ہوئے تھے، اب یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بیک وقت یزدان اور اہرمن، اللہ اور غیر اللہ، حق اور باطل دونوں سے تعلق باقی رکھنا چاہتے تھے۔ یکسو ہو کر نہ وہ اہل ایمان کے اندر شامل ہونا چاہتے تھے نہ مشرکین کے اندر۔ وہ ان دونوں صفوں سے الگ کھڑے ہو کر اپنی مصلحت اور مفاد کو دیکھتے تھے۔ جس حد تک ان کو مسلمانوں کی ہمنوائی میں فائدہ نظر آتا ان کی ہمنوائی کرتے اور جب دیکھتے کہ شرک اور اہل شرک کی تائید میں فائدہ ہے، ان کے ساتھی بن جاتے۔ اس قسم کے دورنگے اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر، اس دور میں، مشرکین اور اہل کتاب کے اندر بھی پیدا ہو گئے تھے جو کفر و اسلام دونوں میں سمجھوتے کے خواہش مند تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ خدا کی بھی بندگی ہونی چاہیے اور ان اصنام و الٰہہ کی بھی جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ آخر یہ بھی کام آنے والی ہستیاں ہیں تو ان کو کیوں نظر انداز کیا جائے؟ یہی گروہ ہے جس کی طرف سے قرآن میں ترمیم کی تجویز بھی پیش ہوئی تھی جس کا ذکر سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔ اس طرح کے عناصر اگر

مسلمانوں میں داخل ہوئے تو وہ توحید میں یکسو نہیں ہوئے۔ جہاں تک ان کو راہ ہموار نظر آتی وہاں تک تو وہ قافلۂ اسلام کا ساتھ دیتے لیکن جب کوئی آزمائش پیش آجاتی تو وہیں لڑکھڑا جاتے اور خدا سے مایوس و بدگماں ہو کر دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنا بیٹھتے۔ یہ چیز اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ اوپر مجادلین کا جو شرک بیان ہوا ہے۔ اس میں اور اس میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ حقیقت کا نہیں بلکہ صرف مزاج کا فرق ہے۔ مجادلین کے شرک کا مزاج معاندانہ ہے، اس کا مزاج منافقانہ۔ اس فرق کے سوا ان دونوں میں کوئی اور فرق نہیں ہے۔ توحید کا تقاضا صرف اس شکل میں پورا ہوتا ہے جب بندہ کلیۃً اپنے آپ کو اپنے رب کی تحویل میں دے دے۔ وہ پھولوں کی سیج پر لٹائے جب بھی راضی رہے اور اگر سر پر آرے چلوا دے جب بھی راضی و مطمئن رہے۔ صرف منفعت ہی کے حد تک جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے وہ موحد نہیں بلکہ مشرک ہے اور خدا کے ہاں ایسے ابن الوقتوں اور مفاد پرستوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ سرمد نے نہایت دوٹوک بات کہہ دی:

سرمد گله اختصار می باید کرد

یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے یار می باید داد

یا قطع نظر ز یار می باید کرد

(سرمد گلے شکوے کو مختصر کر دے اور ان دو کاموں میں سے ایک کام کر، یا اپنے آپ کو یار کی رضا پر چھوڑ دے، یا (اگر ہو سکے تو) یار سے قطع نظر کر لے۔)

'وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ'۔ یہ اسلوب بیان یہاں اظہار تعجب اور اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اور لفظ 'عبادت' پرستش اور اطاعت دونوں ہی معنوں پر مشتمل ہے۔ 'عَلٰى حَرۡفٍ' یعنی ایک کنارے پر کھڑے ہو کر، دور دور سے۔ خدا کی بندگی اور اطاعت میں پوری طرح داخل ہو کر نہیں، جو 'اُدۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً' کا تقاضا ہے بلکہ 'مُذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ' کے مصداق بن کر۔ نہ پوری طرح خدا کی طرف جو ایک حنیف مسلم کی شان ہے اور نہ کفار کی طرح کفر کی حمایت میں برہنہ ہو کر بلکہ ع منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ۔

'وَاِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ'۔ 'فِتۡنَةُ' کے معنی یہاں مصیبت اور آزمائش کے ہیں۔ یہ 'عَلٰى حَرۡفٍ' کی وضاحت ہے کہ یہ احمق لوگ خدا کی بندگی صرف اپنے مفاد کے حد تک کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہر بات ان کے منشا کے مطابق ہوتی رہے اس وقت تک تو

یہ خدا سے راضی و مطمئن رہتے ہیں، لیکن کوئی امتحان پیش آجائے تو پھر یہ اوندھے ہو جاتے ہیں اور خدا کو چھوڑ کر دوسروں کے آستانوں پر جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ پھولوں کے طالب ہیں لیکن کانٹوں کی خلش برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں حالانکہ خدا کی راہ میں راحتوں کے ساتھ آزمائشیں بھی ہیں اور جب تک کوئی ان آزمائشوں میں پورا نہ اترے خدا کے ہاں اس کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔

'خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ' کا مفہوم: 'خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ' فرمایا کہ ایسے احمق لوگ دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد کرتے ہیں۔ اگر دنیا میں بندے کو کوئی آزمائش پیش آتی ہے، وہ جان یا مال کے کسی خسارہ میں مبتلا کیا جاتا ہے تو اس کے لیے اس خسارہ کے اندر ایک عظیم اخروی منفعت بھی پوشیدہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے رب کے فیصلہ پر راضی و مطمئن رہے اور اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دے۔ اس طرح کا امتحان بندے کے ایمان کو پختہ اور اس کی اخروی منفعتوں کو 'اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً' کرتا ہے لیکن کوئی احمق اگر اس طرح کی کسی آزمائش سے گھبرا کر خدا سے مایوس و بدگمان ہو بیٹھے تو اس نے دنیا کا بھی نقصان اٹھایا اور اپنی آخرت بھی برباد کی۔ 'ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ' ظاہر ہے کہ اصلی اور کھلا ہوا خسارہ یہی ہے۔ اگر اس دنیا کا کوئی نقصان ہوا تو وہ نقصان نہیں ہے۔ اگر بندے نے اپنا اخروی اجر اس کے عوض میں محفوظ کرا لیا۔ البتہ جس نے اپنی دنیا بھی کھوئی اور اپنی آخرت بھی اس کا خسران 'خُسْرَانٌ مُّبِيْنٌ' ہے۔

ابنائے زمانہ کا کردار: 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ'۔ میں جس گروہ کا کردار بیان ہوا ہے، غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہی کردار ابنائے زمانہ کا ہے۔ آج ہم بھی، جو اس شرک کو مٹانے ہی کے لیے مامور کیے گئے تھے، اسی طرح دور دور سے خدا بندگی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کو خدا کی کتاب بھی مانتے ہیں لیکن قانون، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست ہر شعبۂ زندگی میں پیروی دوسروں کی کرتے ہیں۔ قرآن کا مصرف اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرے تو، کچھ حافظ اس کے لیے قرآن خوانی کرکے اس کو بخشوا دیا کریں۔ اگرچہ اس نے خود کبھی اتفاق سے بھی قرآن کو ہاتھ نہ لگایا ہو!! ان کے نزدیک قرآن زندوں کے لیے نہیں بلکہ مردوں کے لیے اترا ہے اور وہ ہدایت کے لیے نہیں بلکہ صرف کبھی کبھی چوم لینے کے لیے ہے۔ خوب بات کہی جس نے کہی ہے کہ:

یاران عجب انداز دو رنگی دارند
مصحف بہ بغل دین فرنگی دارند

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾

ترجمہ

یہ خدا کے سوا ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو نہ ان کو نقصان پہنچا سکیں اور نہ کوئی نفع پہنچا پائیں۔ یہی بڑی دور کی گمراہی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

غیر اللہ سے دعا شرک اور ضلال بعید ہے: 'یَدۡعُوۡا' یہاں دعاء، استغاثہ، فریاد، استرحام اور استمداد سب معنوں پر مشتمل ہے۔ اگر خدا کے سوا کسی کو نافع وضار مان کر؛ پکارا جائے تو یہ شرک ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ خدا سے مایوس ہو کر جن سے طالب مدد ہوتے ہیں وہ نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ نفع وضرر صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کو کسی سے کوئی نفع یا ضرر پہنچتا ہے تو اللہ ہی کے اذن سے پہنچتا ہے اس وجہ سے ہر حال میں بندے کا اعتماد اللہ ہی پر ہونا چاہیے نہ کہ اس سے مایوس ہو کر دوسروں پر۔ دوسروں کے نافع یا ضار ہونے کی حقیقت اسی سورہ کے آخر میں ایک تمثیل کے ذریعہ سے یوں واضح فرمادی گئی ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ وَاِنۡ یَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَیۡـًٔا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ (حج:73)

"اے لوگو! ایک تمثیل سنائی جارہی ہے تو اس کو توجہ سے سن لو۔ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سارے کے سارے مل کر اس کے لیے اپنا زور لگا ڈالیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے اس کو بچا نہیں سکتے، طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں !!"

'ذٰلِکَ هُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ'۔ فرمایا کہ دور کی گمراہی در حقیقت یہی ہے۔ مطلب یہ ہے اگر یہ خدا سے روٹھ کر کسی ایسے کی پناہ لیتے جو کوئی نفع یا نقصان ان کو پہنچا سکتا تب تو یہ ایک گمراہی ہوتی لیکن بہت دور کی نہ ہوتی لیکن خدا کی آزمائش سے بھاگ کر ایسوں کی پناہ ڈھونڈھنا جو خود اپنے چہرے سے بھی مکھی ہنکا نہیں سکتے صرف گمراہی نہیں بلکہ بہت دور کی گمراہی ہے۔ یہ خدا کے امتحان کی بھٹی سے بھاگے اور سیدھے جہنم میں جا کودے!

یَدۡعُوا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ ؕ لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰی وَلَبِئۡسَ الۡعَشِیۡرُ ﴿۱۳﴾

ترجمہ

وہ ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جن کا ضرر ان کے نفع سے قریب تر ہے۔ کیا ہی برے ہیں ان کے یہ مرجع اور کیا ہی برے ہیں ان کے یہ ساتھی!!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

ضرر نقد اور نفع موہوم: اس 'یَدۡعُوۡا' کے بارے میں مجھے ان نحویوں کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے جو اس کو سابق الذکر 'یَدۡعُوۡا' کا اعادہ اور بعد کے جملے سے اس کو بالکل غیر متعلق مانتے ہیں۔ اعادۂ فعل یہاں اظہار حسرت و افسوس کے لیے ہے 'لَمَنۡ ضَرُّہٗ' 'یَدۡعُوۡا' کا مفعول نہیں بلکہ اوپر والے مفعول 'مَا لَا یَضُرُّہٗ وَمَا لَا یَنۡفَعُہٗ' پر ایک قسم کا استدراک ہے اور مقصود اس سے اس کے 'ضَلٰلُ بَعِیۡدُ' ہونے کی وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی ضرر یا نفع نہیں پہنچا سکتے بلکہ ستم بالائے ستم ہے کہ ان کا ضرر ان کے نفع سے قریب تر ہے۔ اگر کسی ایسے کی پناہ ڈھونڈھی جائے جو نہ نفع پہنچا سکے نہ ضرر تو یہ حماقت ہے لیکن حماقت در حماقت یہ ہے کہ ایسے کی پناہ ڈھونڈھی جائے جس کا ضرر تو نقد اور ثابت و معلوم لیکن نفع بالکل موہو۔ جنھوں نے خدا سے تعلق توڑ کر دوسروں کو اپنا ولی و کارساز مانا انھوں نے اپنا حقیقی سہارا تو ختم کر دیا رہے دوسرے مزعومہ سہارے تو وہ کام آتے ہیں یا نہیں؟ یہ بعد کی چیز ہے اور یہ بھی ان کے سامنے آجائے گی۔

امام اور مقتدی دونوں ناہنجار: 'لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰی وَلَبِئۡسَ الۡعَشِیۡرُ'۔ یہ فقرہ یہاں بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح آیت 73 میں، جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے، 'ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ' ہے۔ جس طرح وہاں فرمایا ہے کہ "طالب و مطلوب دونوں ہی بے بس و ناتوان" اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ مولیٰ اور عشیر دونوں ہی ایک سے ایک بڑھ کر ناہنجار! 'مولیٰ' سے مراد وہ شرکاء و شفعاء ہیں جن کو خدا کے سوا مرجع اور کارساز بنایا گیا اور 'عشیر' سے مراد وہ مشرکین ہیں جنھوں نے ان کو مرجع و کارساز بنایا۔ پیر اور مرید، امام اور مقتدی، لیڈر اور پیرو دونوں اگر ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے اور برے ہونے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوں تو ان کا انجام معلوم ہے!

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿١٤﴾

ترجمہ

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل صالح کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ بے شک اللہ جو چاہے گا کر ڈالے گا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مخلصین کا انجام: خدا سے مایوس ہو کر دوسروں کی پناہ ڈھونڈھنے والوں کا انجام بیان کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا جو سختی و نرمی اور رنج و راحت ہر طرح کے حالات میں ایمان و عمل صالح کی روش پر قائم و دائم رہیں گے۔ فرمایا کہ بے شک اللہ ان لوگوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ سیاق کلام دلیل ہے کہ یہاں فعل اپنے کامل معنوں میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ یہ مقابل میں ہے 'وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ' کے۔ اس وجہ سے اس سے لازماً وہ لوگ مراد ہوں گے جو دودلی اور نفاق میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ پوری دل جمعی و یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی پر جمے ہوئے ہوں۔

'اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ'۔ یعنی یہ مشرکین تو جن پر تکیہ کیے ہوئے ہیں وہ نہ کوئی نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ کوئی ضرر، یہاں تک کہ اگر کوئی مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس کو بھی اس سے بچا سکنے پر قادر نہیں۔ البتہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ جو چاہے کر ڈالتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے طمانیت و بشارت ہے کہ تم ظاہری حالات کی نامساعدت کو نہ دیکھو۔ حالات خواہ کتنے ہی ناموافق و نامساعد ہوں اپنے رب پر جمے رہو۔ اور اطمینان رکھو کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

مَن كَانَ يَظُنُّ أَن لَّن يَنصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ﴿١٥﴾

ترجمہ:

جو یہ گمان رکھتا ہو کہ خدا دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا تو وہ آسمان تک ایک رسی تانے اور پھر اپنے معاملہ کا فیصلہ کر ڈالے اور دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس کے غم کو دور کرنے والی بنتی ہے؟

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

ضمیر مفعول کا مرجع: 'مَنْ کَانَ یَظُنُّ اَنْ لَّنْ یَّنْصُرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ' 'یَنْصُرَہٗ' میں ضمیر کا مرجع 'من' ہے۔ جن لوگوں نے اس کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا ہے ان کی رائے سیاق وسباق کلام سے بالکل بے جوڑ ہے۔ آیت میں اشارہ انہی دودلوں اور منافقوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ اگر انھیں کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو خدا سے مایوس وبدگمان ہوکر دوسروں کو مولیٰ ومرجع بنا بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیش آمدہ مشکل سے خدا ان کو نہیں نکالے گا یا نہیں نکال سکتا۔

'مدسبب' کا مفہوم: 'فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ'۔ آسمان میں رسی تاننا آخری اور انتہائی تدبیر کر دیکھنے کے لیے اسی طرح کا ایک استعارہ ہے جس طرح ہماری زبان میں تھگلی لگانے کا استعارہ ہے۔ سورۂ انعام میں بھی آسمان میں تھگلی لگانے کا استعارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے:

وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُھُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْسُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَھُمْ بِاٰیَۃٍ ط وَلَوْشَآءَ اللّٰہُ لَجَمَعَھُمْ عَلَی الْھُدٰی فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (انعام:35)

"اور اگر ان لوگوں کا اعراض تم پر ایسا ہی شاق گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگا کر ان کے لیے کوئی نشانی لاسکو تو لادو! اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر مجتمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو!"

زہیر اور اعشیٰ نے بھی انتہائی اور آخری جدوجہد کے مفہوم کے لیے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ زہیر کا مصرع ہے ع

ولو نال اسباب السماء بسلّم

اسی طرح اعشیٰ کہتا ہے۔ ع

ورقیت اسباب السماء بسلّم

'قطع' کا مفہوم: 'ثُمَّ لْیَقْطَعْ'۔ 'قطع' کے معنی ابو مسلم نے قطع مسافت کے لیے یعنی وہ آسمان میں رسی تانے اور آسمان میں چڑھ جائے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی قطع وحی کے لیے ہیں یعنی جس کو یہ گمان ہو کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا وہ آسمان میں چڑھ کر سلسلۂ وحی کو قطع کر دے۔ اکثر لوگوں نے اس کے معنی پھانسی لگانے یا گلا گھونٹ لینے کے لیے ہیں یعنی وہ چھت میں رسی لٹکا کر اپنے آپ کو پھانسی لگالے۔ ان تاویلوں میں جو قباحت ہے اس سے قطع نظر لفظ 'قطع' کا جو مفہوم ان حضرات نے لیا ہے وہی محل نظر ہے۔ وحی کو منقطع کر دینے یا پھانسی لگالینے کے معنی کے لیے تو اس لفظ کا استعمال بالکل ہی ناموزوں ہے، عربیت کا ذوق اس اسے ابا کرتا

ہے۔ کسی مفہوم کے لیے معروف و متداول الفاظ کے ہوتے ہوئے کسی ناموزوں لفظ کا استعمال قرآن کی فصاحت و بلاغت کے بالکل منافی ہے۔ قطع مسافت کے مفہوم کے لیے اگرچہ اس لفظ کو ناموزوں نہیں قرار دیا جا سکتا اس لیے کہ 'قطع وادی' وغیرہ کے محاورات عربی میں معروف ہیں لیکن یہاں اس لفظ کا استعمال اس مفہوم کے لیے بالکل ناموزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آسمان کی طرف رسی تاننے کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ 'فَلْيَتَصَعَّد' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے، 'یقطع' اس کے ساتھ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تمام اقوال ضعیف ہیں۔ البتہ عزم و جزم کے ساتھ کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے کے مفہوم کے لیے یہ لفظ اعلیٰ عربی میں معروف ہے۔ اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ مثلاً سورۂ نمل میں ہے:

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ (نمل:32)

"ملکۂ سبا نے کہا کہ اے درباریو، میرے اس معاملے میں آپ لوگ اپنی رائے دیں۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک آپ لوگ موجود ہو کر مشورہ نہ دیں۔"

خدا سے مایوسی و بدگمانی کا انجام: اجزائے آیت کی تشریح کے بعد اب آیت کے مفہوم پر غور کیجیے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو بدبخت و نامراد خدا سے مایوس و بدگمان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مدد نہیں کرے گا اور اس بدگمانی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو اپنا مولیٰ و مرجع بناتا ہے وہ جو چاہے کر دیکھے، وہ آسمان میں تھگلی لگائے اور انا پورا زور لگا کر اپنے معاملہ کا فیصلہ اور غم اور پریشانی کو اگر دور کر سکتا ہے تو دور کر لے۔ مطلب یہ کہ خدا کو ایسے لاخیروں سے کوئی بحث نہیں۔ وہ جہاں چاہیں آوارہ گردی کریں اور جس جوہڑ سے چاہیں اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کریں۔ لیکن یاد رکھیں کہ انسانی فطرت کے اندر جو پیاس ہے وہ ہر جوہڑ کے پانی سے نہیں بجھ سکتی، وہ صرف ایمان کے حوض کوثر ہی سے بجھتی ہے۔ اور اس کے اندر جو خلا ہے وہ ہر اینٹ پتھر سے نہیں بھرا جا سکتا، اس کو اگر بھرا جا سکتا ہے تو صرف اللہ واحد کی یاد ہی سے بھرا جا سکتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت 124 'وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس آیت سے متعلق بعض مزید سوالات جو پیدا ہوں گے وہ اس سے صاف ہو جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا سے مایوسی و بدگمانی شرک کے بہت بڑے عوامل میں سے ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم اپنی کتاب 'حقیقت شرک' میں کر چکے ہیں۔ انسان جب خدا سے کٹتا ہے تو وہ بہرحال اپنی فطرت سے مجبور ہر کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈھنے کی سعی

کرتا ہے لیکن حقیقی سہارا چونکہ خدا اور صرف خدا ہی ہے اس وجہ سے وہ چاہے آسمان ہی پر چڑھ جائے اس کی ساری سعی لاحاصل ہی رہتی ہے۔

اس آیت میں 'فِي الْآخِرَةِ' کا لفظ بھی قابل غور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں خدا ہی یاور و ناصر ہے اسی طرح آخرت میں بھی خدا ہی یاور و ناصر ہے۔ اگر کوئی خدا کے رحم یا انصاف سے بدگمان ہو کر کسی اور کو اپنا یاور و ناصر بناتا اور سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے مقابل میں اس کے کام آئیں گے تو وہ یہ بھی کر دیکھے۔ اس کے اس وہم کی حقیقت بھی قیامت کے دن اس پر آشکارا ہو جائے گی۔

وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ ﴿١٦﴾

ترجمہ

اور ہم نے اسی طرح اس قرآن کو نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں اتارا ہے کہ لوگ ہدایت حاصل کریں اور بے شک اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یہ آیت بطور تنبیہ کے ہے اور 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ توحید اور ردِ شرک کے ان روشن دلائل کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔ فرمایا کہ اسی طرح نہایت روشن دلائل کے ساتھ ہم نے قرآن کو اتارا ہے۔ اس کے بعد بر بنائے قرینہ یہ مضمون محذوف ہے کہ جو صاحب توفیق ہوں گے وہ آیات پر ایمان لائیں گے اور جو توفیق سے محروم ہوں گے وہ، جیسا کہ اوپر آیت 8 میں اشارہ ہوا، اللہ اور اس کی آیات میں کٹھ حجتی ہی کرتے رہیں گے۔ 'وَاَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ' میں اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ہدایت و ضلالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی وضاحت ہم بار بار کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ جو اندھے بہرے بن جاتے ہیں ان کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١٧﴾

ترجمہ

جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے یہودیت اختیار کی اور صابئین، نصاریٰ، مجوس اور جنھوں نے شرک کیا، اللہ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مشرکین اور ان کے اتحادیوں کو تنبیہ: اس آیت میں جن گروہوں کا ذکر ہے ان میں سے مجوس اور مشرکین کے سوا ہر گروہ کا ذکر سورۂ بقرہ آیت 62 میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے یہود، نصاریٰ اور صابئین، سب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات 187-182 جلد اول۔ مجوس اصلاً تو دین زردشت کے پیرو تھے اور دین زردشت کی بنیاد، جیسا کہ ہم سورۂ کہف میں بیان کر چکے ہیں، خالص توحید پر تھی لیکن جس طرح امتداد زمانہ سے ہر دین کا حلیہ بگڑا اسی طرح اس دین کے پیرو بھی اپنے اصل دین کو مسخ کر کے آتش پرستی اور دوسری مشرکانہ بدعتوں میں مبتلا ہو گئے۔

اوپر کی آیات میں مومنین اور مشرکین کے درمیان جس مناظرہ ومجادلہ کا ذکر ہوا ہے یہ آیت بھی اسی سے متعلق ہے۔ اس مناظرہ کے اصلی فریق تو مسلمان اور مشرکین قریش ہی تھے لیکن اس دور میں، جیسا کہ پیچھے کی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، دوسرے مذاہب کے پیرو بھی، جو عرب میں موجود تھے، اس میں فریق بن گئے، اور چونکہ اسلام کی دعوت کی زد ان سب پر پڑتی تھی اس وجہ سے ان کی ہمدردیاں مشرکین کے ساتھ تھیں، خاص طور پر یہود و نصاریٰ تو کھلم کھلا ہر محاذ پر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن نے ان سب کو نام لے کر آگاہ کیا کہ آج خدا اور اس کی آیات کے باب میں جو محاذ گرم ہے وہ یہیں نہیں ختم ہو جائے گا بلکہ یہ قضیہ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں بھی پیش ہونے والا ہے جس میں ایک طرف اہل ایمان ہوں گے، دوسری طرف یہ مشرکین اور ان کے ہمنوا۔۔۔ یہود، صابئین، نصاریٰ اور مجوس۔۔۔ اس دن خدا فیصلہ فرمائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'فیصلہ' سے مقصود اس کے نتیجہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس دن ہر ایک کے سامنے اس کی اس سعی و سرگرمی کے نتائج آجائیں گے جس میں وہ آج مصروف ہے۔ اہل ایمان اپنی جانبازیوں کا صلہ پائیں گے اور کفار و مشرکین اور ان کے اتحادی اپنی سرگرمیوں کے نتائج بھگتیں گے۔

'اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ'۔ اہل ایمان کے لیے پیام تسلی اور اہل شرک اور ان کے حامیوں کے لیے تہدید و وعید ہے کہ خدا ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اپنے باایمان بندوں کی جانبازیوں اور سرفروشیوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور مخالفین کی سازشوں اور شرارتوں کو بھی۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ ٹھیک ٹھیک وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ٹھہرے گا۔

جو اہل ایمان کے ساتھ نہیں وہ اہل کفر ہیں: اس آیت میں آپ نے غور کیا ہو گا کہ سب سے پہلے اہل ایمان کا ذکر ہوا ہے اور آخر میں مشرکین کا اور بیچ میں دوسرے مختلف فرقوں کا۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ اصل فریق کی حیثیت اس مباحثہ و مناظرہ میں انہی دو کو حاصل تھی، باقی گروہوں کی حیثیت ضمنی تھی۔ چنانچہ آگے آیت 19 میں تصریح بھی ہے کہ اصل فریق دو ہیں۔ اہل ایمان اور اہل کفر و شرک۔ جو اہل ایمان کے ساتھ نہیں ہے وہ اہل کفر میں سے ہے، خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی دین کی پیروی کا مدعی ہو۔

اسم اور فعل کے مواقع استعمال میں ایک نازک فرق: آیت میں مختلف گروہوں کے ذکر کے لیے جو اسلوب بیان اختیار فرمایا گیا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ مسلمانوں اور یہود و مشرکین کا ذکر تو فعل کی شکل میں ہوا اور صابئین، نصاریٰ اور مجوس کا اسم کی شکل میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملاً اس میدان میں ایک طرف مسلمان تھے، دوسری طرف مشرکین اور یہود۔ مشرکین کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں اپنے حسد و عناد کے باعث بہت سرگرم تھے۔ باقی فرقوں کی ہمدردیاں اگرچہ تھیں تو مشرکین ہی کے ساتھ لیکن وہ کچھ زیادہ سرگرم نہ تھے۔ اس وجہ سے معرکہ کے اصلی حریفوں کو تو فعل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور دوسروں کا ذکر اسم کے ساتھ۔ زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ فعل کے اندر ایک قسم کی سرگرمی کا مفہوم پایا جاتا ہے جب کہ اسم بالعموم صرف علامت امتیار کا فائدہ دیتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۩ ﴿١٨﴾

ترجمہ

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے۔ اور بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے۔ اور جن کو خدا ذلیل کر دے تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک اللہ ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ (سجدہ)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

کائنات کی ہر چیز سجدے میں ہے: یہ توحید کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جس کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز اپنے وجود سے دے رہی ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز اپنی تکوینی حیثیت میں ابراہیمی مزاج رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور چوپائے سب خدا کے امر و حکم کے تحت مسخر ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی سر مو خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین سے انحراف نہیں اختیار کرتی۔ سورج، جس کو نادانوں نے معبود بنا کر سب سے زیادہ پوجا ہے، خود اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ وہ شب و روز اپنے رب کے آگے قیام، رکوع اور سجدے میں ہے۔ طلوع کے وقت وہ سجدے سے سر اٹھاتا ہے، دوپہر تک وہ قیام میں رہتا ہے، زوال کے بعد وہ رکوع میں جھک جاتا ہے اور غروب کے وقت وہ سجدے میں گر جاتا ہے اور رات بھر اسی سجدے کی حالت میں رہتا ہے۔ اسی حقیقت کا مظاہرہ چاند اپنے عروج و محاق سے اور ستارے اپنے طلوع و غروب سے کرتے ہیں۔ پہاڑوں، درختوں اور چوپایوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں سے ہر چیز کا سایہ ہر وقت قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ اور غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی نظر آئے گی کہ اس سایہ کی فطرت ایسی ابراہیمی ہے کہ یہ ہمیشہ آفتاب کی مخالف سمت میں رہتا ہے۔ اگر سورج مشرق کی سمت میں ہے تو سایہ مغرب کی جانب پھیلے گا اور اگر مغرب کی جانب ہے تو ہر چیز کا سایہ مشرق کی طرف پھیلے گا۔ گویا ہر چیز کا سایہ اپنے وجود سے ہمیں اس بات کی تعلیم دے رہا ہے کہ سجدہ کا اصل سزاوار آفتاب نہیں بلکہ خالق آفتاب ہے۔

توحید کی یہ دلیل اشارات کی نوعیت کی ہے اس وجہ سے یہ منطق کی گرفت میں نہیں آتی لیکن نظام کائنات میں تدبر کرنے والوں کی نظر میں ان اشارات کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ع

آں کس است اہلِ بشارت کہ اشارت داند

یہی دلیل سورۂ رعد میں یوں بیان ہوئی ہے:

وَلِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ کَرۡہًا وَّظِلٰلُہُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ. (رعد 15)

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خواہ طوعاً یا کرہاً اور ان کے سائے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں صبح و شام۔

اس آیت کی وضاحت سورۂ رعد میں ہم کر چکے ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس میں 'ظِلٰلُہُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ' کے الفاظ اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اگر کوئی شامت کا مارا اپنے دائرۂ اختیار میں خدا کو سجدہ کرنے سے بغاوت کرتا ہے تو اس کا اپنا سایہ اپنی شہادت حال سے اس پر اظہار نفرت کرتا ہے اور وہ بدستور اپنی ابراہیمی فطرت پر جمع رہتا ہے، کسی حال میں بھی کسی غیر اللہ کے آگے جھکنے کا ننگ گوارا نہیں کرتا۔

سورۂ نحل میں یہی دلیل اس طرح بیان ہوئی ہے:

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَ ہُمۡ دٰخِرُوۡنَ ۔ وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ. (نحل:49-48)

کیا ان لوگوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ ان کے سائے داہنے اور بائیں سے لوٹتے ہیں اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہوئے اور وہ اس کے آگے سر فگندہ ہوتے ہیں اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں آسمانوں اور زمین میں جو جاندار بھی ہیں اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

سب سے بڑا شرف سب سے بڑی ذلت: 'وَکَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ وَکَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡہِ الۡعَذَابُ' یعنی یہی حال ان بہت سے اللہ کے بندوں کا بھی ہے جن کی فطرت سلیم ہے۔ جس طرح کائنات کی تمام بے ارادہ اشیاء اللہ ہی کے امر کے تابع اور اسی کے آگے سر بسجود ہیں اسی طرح اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اختیار و ارادے کو اللہ ہی کے امر و حکم کے تابع کر دیا ہے اور وہ اپنے رب کے سوا کسی ار کو سجدہ نہیں کرتے لیکن بہتوں نے اپنے اس اختیار و ارادہ کو غلط استعمال کیا ہے اور اس سب سے بڑے شرف کو، جو اللہ نے ان کو بخشا، اپنی شامت اعمال سے انھوں نے اپنے لیے سب سے بڑی گمراہی اور سب سے بڑی ذلت کا سبب بنالیا۔ کائنات کی چیزوں کا حال تو یہ ہے کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی خدمت کے لیے بنایا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ انسان کو سجدہ کرے لیکن انسان کی رذالت و سفاہت کا حال یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہوتے ہوئے اپنے سے فروتر مخلوقات کو معبود مان کر ان کے آگے ڈنڈوت کرتا ہے! فرمایا ہے کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کا عذاب واجب ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے کو بھی ذلیل کیا اور اپنے رب کی بھی نہایت تحقیر کی۔

انسان کا شرف کردار کے ساتھ مشروط ہے: 'وَمَنۡ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنۡ مُّكۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ'۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جو شرف بخشا ہے وہ صفات و کردار کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ اس شرف کا حق ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے شرف کو قائم رکھتا ہے اور اس کے درجات و مراتب میں اضافہ فرماتا ہے اور اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتا تو وہ اس کو اپنی سنت کے مطابق اسی گڑھے میں گرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے جس میں وہ گرنا چاہتا ہے۔ 'نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى' اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ اس سنت الٰہی کی زد میں آجاتے ہیں ان کو کوئی دوسرا سنبھالنے والا نہیں بن سکتا۔

اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ اب یہ لوگ جس ذلت کے گڑھے میں گر چکے ہیں اس سے ان کو نکالنے کے لیے تم لاکھ جتن کرو لیکن یہ اس سے نکلنے والے نہیں ہیں۔ خدا کی مشیت کا فیصلہ اس اتمام حجت کے بعد یہی ہے کہ اب یہ اس ذلت کی مار کھائیں۔

من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید: اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ انسان کا اصلی شرف توحید ہے، اگر وہ اس شرف سے اپنے کو محروم کر لے تو اس کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بھی وہ فروتر اور حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ دوسری حقیقت اس سے یہ واضح ہوئی کہ اس کائنات کے ساتھ انسان کی ہم آہنگی اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس کی پیشانی کسی غیر اللہ کے سجدے سے آلودہ نہیں ہوتی۔ اگر وہ اس ذلت پر راضی ہو جائے تو وہ اس پوری کائنات سے بالکل بے جوڑ اور گول خانے میں ایک چوکھٹی چیز بن کر رہ جاتا ہے یہاں تک کہ خود اس کا اپنا سایہ بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر اس میں اور اس کے سایہ میں ایسی بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس پر '**من چه می سرایم و طنبورهٔ من چه می سراید**'[1] کی مثل صادق آتی ہے۔

هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِىۡ رَبِّهِمۡ‌ ۖ فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِيَابٌ مِّنۡ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِيۡمُ ﴿۱۹﴾

ترجمہ

یہ دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں اختلاف کیا تو جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے جامے تراشے جائیں گے۔ ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی بہایا جائے گا۔

---

[1] میں کس سُر میں گا رہا ہوں اور میرا طنبورہ کیا سُر بجا رہا ہے

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

دونوں گروہوں کے انجام کی تفصیل: اب یہ ان دونوں فریقوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۱۷ میں گزرا۔ وہاں صرف اس قدر اشارہ فرمایا تھا کہ ایک دن آئے گا جب اللہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا، ان کے انجام کی تفصیل اس آیت میں بیان نہیں ہوئی تھی۔ ان آیات میں ان کے انجام کی تفصیل آرہی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب: آیت ۱۷ میں کئی گروہوں کا ذکر ہے اور یہاں 'هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ' کے الفاظ ہیں۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس آیت میں انہی گروہوں کی طرف اشارہ ہے تو ان کے لیے مثنیٰ کا صیغہ کیوں استعمال ہوا، جمع کا صیغہ کیوں نہیں استعمال ہوا؟ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان، کلام عرب کی روشنی میں اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اگر فریق دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے مثنیٰ اور جمع دونوں کے صیغے استعمال ہوسکتے ہیں۔ یہاں 'اِخۡتَصَمُوۡا' کے صیغۂ جمع سے بھی ان کے خیال کی تائید نکلتی ہے۔ لیکن میرا رجحان، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا، اس بات کی طرف ہے کہ یہاں اوپر کے گروہوں کا ذکر، ان کے ظاہری تعدد کو نظر انداز کر کے، ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہوا ہے۔ فی الظاہر تو یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور مشرکین الگ الگ گروہ تھے لیکن جہاں تک توحید اور اسلام کی مخالفت کا تعلق ہے اس میں یہ سب مشترک تھے۔ ان کی مخالفت کا مزاج، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، الگ الگ ضرور تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں، اپنے اپنے رجحان کے مطابق، سب شریک تھے اس وجہ سے قرآن نے 'اَلۡکُفۡرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ' کے اصول کے مطابق ان سب کو ایک ہی پارٹی قرار دیا اور ان کے مقابل میں مسلمانوں کو ایک مستقل پارٹی کی حیثیت دی اور اسی حیثیت سے دونوں کے انجام کو بیان فرمایا۔

'اِخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّہِمۡ' میں اسی بحث و جدال کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں اور ان کی مخالف پارٹیوں کے درمیان درباب شرک و توحید برپا تھا اور جس کا ذکر اوپر آیت ۱۳ اور آیت ۸ میں گزر چکا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ توحید اور شرک کے اس معرکے میں اہل کتاب نے، اہل کتاب ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوئے، کھلم کھلا مشرکین عرب کا ساتھ دیا۔

شرک اپنی حقیقت کے اعتبار سے کفر ہے: 'فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا' سے مراد وہ تمام پارٹیاں ہیں جنھوں نے توحید و شرک کی اس جنگ میں شرک کا ساتھ دیا۔ شرک کو کفر سے تعبیر کرنے کی وجہ کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ شرک اپنی اصل حقیقت و غایت

کے اعتبار سے کفر ہی ہے اسی وجہ سے قرآن میں شرک کو کفر سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ شرک کو کفر کے مقابل میں اھون خیال کرتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

جزاء اور عمل کی مطابقت: 'قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ' یعنی اس دنیا میں وہ حق کی مخالفت کے جوش میں نفرت، غصہ، حسد اور انتقام کی جس آگ میں جلتے رہے ہیں اس کی پاداش میں آخرت میں ان کے لیے آگ ہی کا جامہ تراشا جائے گا اور ان کے سروں پر کھولتا پانی انڈیلا جائے گا جو ان کے تمام اندرونی احشاء اور ان کے بیرونی کھالوں کو پگھلا کے رکھ دے گا۔

يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ ﴿٢٠﴾

ترجمہ

اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے سب پگھل جائے گا اور ان کی کھالیں بھی۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یعنی اس دنیا میں وہ حق کی مخالفت کے جوش میں نفرت، غصہ، حسد اور انتقام کی جس آگ میں جلتے رہے ہیں اس کی پاداش میں آخرت میں ان کے لیے آگ ہی کا جامہ تراشا جائے گا اور ان کے سروں پر کھولتا پانی انڈیلا جائے گا جو ان کے تمام اندرونی اعضاء اور ان کی بیرونی کھالوں کو پگھلا کے رکھ دے گا۔

وَلَهُم مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٢٢﴾

ترجمہ

اور ان کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ جب جب وہ اس کے کسی عذاب سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیلے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کا عذاب!!

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت:

'مَقَامِعُ' کے معنی ہتھوڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے موجود ہوں گے۔ اگر وہ دوزخ کی کسی آفت سے بھاگنے کی کوشش کریں گے تو انہی ہتھوڑوں سے ان کی سرکوبی کر کے اسی آفت میں پڑے رہنے کے لیے ان کو واپس کیا جائے گا۔ 'مِنْ غَمٍّ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہاں دوزخ سے بھاگ نکلنے کا تو کوئی تصور بھی نہ کر سکے گا۔ بس زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کوشش کر سکے گا تو اس بات کی کر سکے گا کہ ایک آفت کی شدت سے گھبرا کر کسی دوسری آفت کی پناہ ڈھونڈھے لیکن اس کا امکان بھی وہاں نہیں ہو گا۔ دوزخ کے داروغے لوہے کے ہتھوڑوں سے ان کی سرکوبی کریں گے۔

زبان حال کی تعبیر: 'وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ' یہ زبان حال کی تعبیر ہے۔ یعنی صورت حال خود ان کو پکار کر سنا دے گی کہ اب یہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے، اب اسی میں رہو اور جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو! اسی طرح کے مواقع میں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں، 'قِیْلَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبان حال زبان قال سے زیادہ ناطق اور فصیح البیان ہوتی ہے۔ یہاں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق معطوف علیہ محذوف ہے۔ یعنی 'اِخْسَـُٔوْا فِیْھَا. وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ' اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہاں عمل اور جزا کی مشابہت کے پہلو پر بھی نگاہ رہے۔ جن لوگوں کو قعر ہلاکت سے نکالنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علی وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں نے اپنا سارا زور صرف کر ڈالا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اس سے نکلنے پر راضی نہ ہوئے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے اس بنا پر دشمن بن گئے کہ انھوں نے ان کو اس سے نکالنے کی کوشش کی تو آخرت میں جب اس کی حقیقت سامنے آئے گی تو اس سے بھاگنے کے کیا معنی؟ دنیا میں جس چیز سے ان کو اتنا عشق رہا اب اس کا مزہ چکھیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾

ترجمہ

ہاں، اللہ ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے، ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا پہناوا یکسر ریشم ہو گا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اہل حق کے انجام کی تفصیل: مخالفین حق کا انجام بیان کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو مخالفین کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم موقف حق پر ڈٹے رہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ 'یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّلُؤۡلُؤًا' میں 'لُولُوا'، 'اساور' کے محل پر عطف ہے۔ یعنی وہ اس جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔ 'وَلِبَاسُہُمۡ فِیۡہَا حَرِیۡرٌ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس جنت میں ان کا لباس ریشم ہی ریشم ہو گا۔ اسی کا لباس، اسی کا اوڑھنا، اسی کا بچھونا، اسی کے دوسرے لوازم۔

وَہُدُوۡۤا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ وَہُدُوۡۤا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ ﴿۲۴﴾

ترجمہ

اور ان کی رہنمائی پاکیزہ کلمۂ حمد کی طرف اور ان کی رہنمائی خدائے حمید کی راہ کی طرف ہو گی!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'قول طیب' سے مراد: 'وَہُدُوۡۤا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ' سے اہل جنت کے اس کلمۂ حمد و شکر کی طرف اشارہ ہے جو ان کی زبانوں سے بے تحاشا اس وقت ادا ہو گا جب وہ دیکھیں کہ ان کے رب نے جتنے وعدے کیے وہ سب پورے ہوئے۔ سورۂ زمر آیت ۷۴ میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے:

'وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَہٗ'

(اور وہ سب پکار اٹھیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کیے)

اسی ترانۂ حمد کا ذکر سورۂ فاطر آیت ۳۴-۳۵ میں بھی ہے:

'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَکُوْرُ نِ الَّذِیٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَۃِ مِنْ فَضْلِہٖ'

(اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے غم کو دور کیا، بے شک ہمارا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا اور پزیرائی فرمانے والا ہے۔ جس نے اپنے فضل سے ہمیں قرار کی منزل میں اتارا)

'صراط الحمید' کا مفہوم: 'وَھُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ'۔ 'صِرَاطِ الْحَمِیْدِ' سے مراد میرے نزدیک اسی 'دَارُ الْمُقَامَۃِ' کی شاہراہ ہے جس کی طرف سورۂ فاطر کی محولہ بالا آیت میں اشارہ ہوا۔ یہاں لفظ ہدایت، منزل مقصود کی طرف ہدایت کے مفہوم میں ہے اور صیغۂ مجہول تشریف و تکریم پر دلیل ہے کہ ملائکہ کی ایک جماعت کے ذریعہ سے ان لوگوں کی رہنمائی اس شاہراہ کی طرف کی جائے گی جو اس دارالمقامۃ تک ان کو پہنچائے گی جو خدائے حمید نے ان کے قیام کے لیے پسند فرمایا ہے۔

مشاہدۂ حق کے احوال کی تعبیر بادہ وساغر کے الفاظ سے: یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ کے احوال کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہے۔ ان کو مخاطب کے ذہن سے قریب لانے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کی تعبیر کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا جائے جس سے مخاطب مانوس ہوں۔ اہل عرب مصریوں اور ایرانیوں کے تمدن سے متاثر تھے اس وجہ سے تنعم ورفاہیت کی تعبیر کے لیے وہی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جس میں یا تو خود ان کے اپنے تصورات تنعم کی جھلک ہوتی ہے یا پھر ان تصورات کی جھلک ہوتی ہے جن سے فی الجملہ وہ آشنا تھے۔ ان تصورات میں زمانہ کے اختلاف سے بھی بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے الفاظ کی بجائے ہمیشہ حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے۔ پس یہ ماننا چاہیے کہ اہل جنت کو یہ نعمتیں حاصل ہوں گی جو قرآن میں مذکور ہوئیں، رہی یہ بات کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے تو ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ جس طرح بعض اوقات مشاہدۂ حق کے احوال و معاملات کے لیے بادہ و ساغر کی تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں اسی طرح احوال آخرت کی تعبیر ان الفاظ و تمثیلات سے کی جاتی ہے جو مخاطب کے لیے قریب الفہم ہوں۔

آگے کا مضمون ——— آیات ۲۵ – ۳۷

توحید و شرک کی جو بحث اوپر سے چلی آ رہی ہے یہاں وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، قریش اور ان کے ہمنواؤں نے اس دور میں جو اتنی شدید خصومت کی روش اختیار کرلی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے

تھے کہ دعوتِ توحید اور ابطالِ شرک کی اس جدوجہد کی نوعیت صرف ایک کلامی و اعتقادی نزاع کی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرب ان کی اس مہنتی اور سیادت و قیادت پر بھی پڑنے والی ہے جو ان کو حرم کی تولیت کی بدولت حاصل ہے۔ قریش نے حرم پر اپنا قبضہ جما رکھا تھا اور ان دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس وراثت کت اصلی حقدار اور متولی و امین وہی ہیں۔خاندانِ بنی ہاشم کو کعبہ کی کلید برداری کا منصب حاصل تھااور ان کا سرغنہ اس زمانے میں ابو لہب تھاجو رفادہ کے تمام خزانے پر غاصبانہ قابض اور اس میں من مانے تصرفات کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قریش کو صرف مکہ ہی میں سیادت و امارت حاصل نہیں تھی بلکہ حرم کے پاسبان سمجھے جانے کے سبب پورے عرب پر ان کی مذہبی پیشوائی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ایسے حالت میں وہ ایک ایسی دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں کس طرح برداشت کر سکتے تھے جو ان کو ان تمام مفادات سے یک قلم محروم کردے۔چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو حرم کی حاضری سے بھی محروم کردیااور ظلم و تشدد کے زور سے ان کو سرزمین مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ان حالت میں یہ آیات اتریں جن میں یہ حقیقت وضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو کس مقصد کے لیے بنایا تھا، ان کی دعوت کیا تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کن شعائر و مناسک کی تعلیم دی تھی۔یہ گویا ایک آئینہ تھا کہ وہ اس میں اپنا منہ دیکھ کر خود فیصلہ کرلیں کہ وہ اس وراثتِ ابراہیمی کے حق دار ہیں یا غاصب و غدار ! ضمناً مسلمانوں کی اس میں حوصلہ افزائی بھی فرمائی گئی ہے اور ان کو ان کی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ فرمایا گیا ہے۔جو آگے اس گھر کے مناسک و شعائر سے متعلق ان پر عائد ہونے والی ہیں۔۔۔۔۔اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٥﴾

ترجمہ

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں جس کو ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا، خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا آفاقی (توانھوں نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا) اور جو اس میں کسی بے دینی، کسی شرک کے ارتکاب کا ارادہ کریں گے تو ہم ان کو ایک عذاب دردناک کا مزا چکھائیں گے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

تالیف کلام کی دو شکلیں: اس آیت میں تالیف کلام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ 'اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' سے لے کر 'الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ' تک پورے ٹکڑے کو بطور توطیہ و تمہید مانیے اور اصل مبتداء 'وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ' کو قرار دیجیے۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں خبر کو یعنی 'فَقَدْ ظَلَمُوْا ظُلْمًا كَبِيْرًا' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف مانیے۔ عربیت کے قاعدے سے یہ دونوں شکلیں صحیح ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان پہلی صورت کی طرف ہے اور میرا رجحان دوسری شکل کی طرف۔ میں نے ترجمے میں اسی کا لحاظ رکھا ہے لیکن آیت کی تاویل میں، دونوں ہی صورتوں میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہو گا۔

اشارہ قریش کی طرف: 'اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'۔ یہ اشارہ قریش کی طرف ہے۔ جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر دیا تھا اور مسلمانوں کو جبر وزور کے ذریعہ سے اللہ کے دین سے بھی روک رہے تھے اور اس دور میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، انھوں نے مسلمانوں کو حرم کی حاضری سے بھی محروم کر دیا تھا۔

بنی ہاشم کی مہنتی پر ضرب: 'الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ'۔ یہ مسجد حرام کی تعریف ہے کہ اللہ نے اس میں حدود حرم کے مقیمین اور باہر سے آنے والوں دونوں کے حقوق یکساں رکھے ہیں۔ یہ قریش کی اجارہ داری اور خاص طور پر بنی ہاشم کی مہنتی پر ضرب ہے کہ انھوں نے اللہ کے اس گھر پر اپنا جو تسلط مالکانہ و حاکمانہ جما رکھا ہے، جس کو چاہیں اس میں آنے دیں، جس کو چاہیں اس کی حاضری سے محروم کر دیں یہ بالکل ناجائز ہے۔ اس گھر پر کسی خاص خاندان کا اجارہ نہیں ہے۔ ہر شخص جو اللہ کی عبادت اور حج و طواف کے لیے اس گھر کا قصد کرے، خواہ قرشی وہاشمی ہو یا غیر قرشی وہاشمی، مکی ہو یا غیر مکی، عربی ہو یا عجمی اس کے اوپر کسی کو کوئی قدغن عاید کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے مقیمین کا اگر کوئی حق و فرض ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اس کو ان گندگیوں سے پاک وصاف رکھیں جن سے اس کو پاک وصاف رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا تھا اور جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ لیکن قریش کی یہ ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے اللہ کے اس گھر کو ان تمام نجاستوں سے تو بھر دیا ہے جن سے پاک رکھنے کی اللہ نے ہدایت فرمائی تھی لیکن اس کی تولیت کے مدعی بنے بیٹھے ہیں اور اللہ کے ان بندوں کو اس سے روک رہے ہیں جو اس کو اس کے اصل ابراہیمی حسن و جمال سے از سر نو منور کرنا چاہتے ہیں۔

'اَلْعَاكِفُ وَالْبَادِ' کا عام مفہوم تو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہاں مقیم و آفاقی کا ہے لیکن حرم کے باشندوں کے لیے عاکف، کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے ان کی اصل حیثیت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کی حیثیت حرم الٰہی کے ٹھیکیداروں، اجارہ داروں اور حکمرانوں کی نہیں ہے بلکہ اس کے معتکفین اور خدمت گزاروں کی ہے۔ وہ اس کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح تمام دنیا کے لیے حج و عبادت کا مرکز بنائیں اور تمام خلق کو دعوت دیں کہ لوگ ان کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے اس آستانۂ الٰہی پر آئیں۔

مسجد حرام پر کسی خاندان یا حکومت کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی: ان الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک مسجد حرام کا تعلق ہے اس پر کسی خاندان یا کسی مخصوص حکومت کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ اس میں عرب و عجم اور شرق و غرب کے تمام مسلمانوں کے حقوق بالکل یکساں ہیں۔ اہل مکہ یا ان کی حکومت کی حیثیت اس کے مالکوں کی نہیں بلکہ اس کے پاسبانوں اور خدمت گزاروں کی ہے۔ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو شرک و بدعت کے ہر شائبہ سے پاک و صاف رکھیں اور اللہ کے جو بندے حج و قربانی کے لیے وہاں پہنچیں ان کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کریں لیکن کسی حال میں بھی دنیا کے کسی خطہ کے کسی مسلمان کو وہ اس کی حاضری سے محروم نہیں کر سکتے الّا آنکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ اللہ کے اس گھر کو ان مقاصد کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تعمیر فرمائی ہے۔

مسجد حرام کی حفاظت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمہ داری ہے: حقوق کے ساتھ ساتھ اس گھر کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری میں بھی دنیا کے مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ جو لوگ اس کے پاسبان ہیں وہ اس کو ان چیزوں سے آلودہ کر رہے ہیں جن سے اللہ نے اس کو پاک صاف رکھنے کا حکم دیا ہے تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی یہ مشترک ذمہ داری ہے کہ وہ پاسبانوں کے ہاتھ پکڑیں۔ اس کے پاسبان یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ان کے گھر کا داخلی معاملہ ہے، دوسروں کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔

اسی طرح اگر خدانخواستہ کوئی بیرونی طاقت اس پر حملہ کر دے تو اس کی حفاظت و مدافعت کے لیے تمام دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جائے گا۔ اس معاملے میں کسی قومی یا بین الاقوامی معاہدے اور مصلحت کا بھی کوئی لحاظ جائز نہیں ہو گا۔ اگر کسی ملک کی حکومت اس جہاد میں شرکت سے روکے تو ہر چند وہ نام نہاد مسلمانوں ہی کی حکومت ہو، اس کے خلاف بھی اہل ایمان پر فرض ہو گا کہ وہ جہاد کریں، اس لیے کہ حرم کی حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری صرف اہل مکہ یا ان کی حکومت پر نہیں ہے بلکہ ہر کلمہ گو پر ہے۔ اس کو کسی صورت میں بھی پرایا جھگڑا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حرم کے حقوق اور ذمہ داریوں میں ہر مسلمان برابر کا شریک ہے۔ حرم امت مسلمہ کا دل ہے۔ اس کی صلاح تمام امت کی صلاح اور اس کا فساد پوری ملت کا فساد ہے۔

فقہاء کا ایک ضعیف استنباط: 'سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ' کے الفاظ سے یہ نتائج تو بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے لیکن ہمارے فقہاء کی ایک جماعت نے اس سے یہ مسئلہ بھی استنباط کیا ہے کہ حدود حرم میں نہ کوئی گھر کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتا اور نہ وہ کسی دوسرے سے کسی گھر کا کرایہ وصول کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ استنباط ضعیف ہے۔ آیت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ 'جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ' کے الفاظ مسجد حرام کی صفت کی حیثیت سے وارد ہوئے ہیں، پورے مکہ یا تمام حدود حرم کی صفت کے طور پر نہیں آئے ہیں۔ اس وجہ سے میں اس مسئلہ میں شوافع کے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں جو اس پابندی کے حق میں نہیں ہیں۔

'وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ م بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ'۔ 'يُرِدْ' کے بعد 'ب' کا صلہ اس امر کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'همّ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔ 'الحاد' کے معنی انحراف، کجی اور بے دینی کے ہیں۔ 'بظلم' 'بالحاد' سے بدل واقع ہے۔ اور یہ لفظ شرک کے مفہوم کے لیے قرآن مجید میں معروف ہے۔

ہشدار کہ رہ بردم تیغ است ادم را! آیت کا مدعا یہ ہے کہ یہ گھر ہے کہ اس میں اگر کوئی کسی بے دینی کا اور وہ بھی شرک جیسی بے دینی کا ارادہ کرے گا تو ہم اس کو ایک عذاب دردناک کا مزا چکھائیں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ارادہ، اور 'همّ' میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ارادہ تو سوچ سمجھ کر ظہور میں آتا ہے لیکن 'همّ' جیسا کہ 'وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا' (توبہ: ۷۴) 'وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا' (یوسف: ۲۴) وغیرہ آیات میں وارد ہے کسی وقتی میلان نفس سے بھی ظہور میں آجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس گھر کے شرائط و آداب بہت سخت ہیں۔ یہاں ان غلط چیزوں پر بھی گرفت ہے جو وقتی میلانات نفس سے ظہور میں آجاتی ہیں۔ ع

ہشدار کہ رہ بردم تیغ است ادم را

'الحاد' کے بعد 'ظلم' کا اضافہ کر کے یہ حقیقت واضح فرما دی کہ جب یہاں معمولی کجروی بھی قابل گرفت ہے تو اس شرک عظیم کے لیے یہاں کس طرح گنجائش نکل سکتی ہے جس کا ایک وسیع کاروبار یہاں قریش نے پھیلا رکھا ہے!

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿٢٦﴾

ترجمہ

اور یاد کرو، جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے ٹھکانا بنایا بیت اللہ کی جگہ کو اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

حضرت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کی صحیح تاریخ: اب یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیت اللہ کی تاریخ بیان ہو رہی ہے تاکہ قریش پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جن مقاصد کے لیے اللہ نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام سے یہ گھر تعمیر کرایا تھا وہ سارے ہی مقاصد انھوں نے برباد کر کے رکھ دیے ہیں اس وجہ سے یہ سزاوار ہیں کہ اب یہاں سے بے دخل ہوں اور وہ لوگ اس کے ذمہ دار بنائے جائیں جو اس عظیم امانت الٰہی کا حق ادا کرنے والے ہوں۔

'وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ'۔ 'تبویہ' کے معنی ٹکانے، ٹھہرانے، آباد کرنے اور بسانے کے ہیں۔ یعنی تاریخ کی اس سرگزشت کو یاد کرو جب کہ ہم نے خاص اپنے حکم سے، ابراہیمؑ کی ہجرت کے بعد، ان کو اور اسماعیلؑ کو اس جگہ بسایا جس جگہ بیت اللہ ہے۔ 'بَوَّاۡنَا'۔ کے بعد 'ل' اس امر کا قرینہ ہے کہ یہ مقام صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کا مسکن نہیں ٹھہرایا گیا تھا بلکہ ان کی ذریت (حضرت اسماعیلؑ) کا مسکن بھی یہ قرار پایا تھا۔ اہل عرب اپنی اس تاریخ سے بالاجمال واقف اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اولاد اور ان کی ملت کے وارث ہیں لیکن یہود نے یہ سازش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بہت پہلے ہی تورات سے وہ ساری چیزیں نکال دیں یا ان کی تحریف کر دی جو حضرت ابراہیمؑ کے بیت اللہ کے ساتھ تعلق کی شہادت دینے والی تھیں تاکہ آخری رسول کی بعثت بنی اسمٰعیل کے اندر نہ ثابت ہو سکے۔ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی ایک من گھڑت تاریخ بنائی اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کے بعد اپنا مستقر شام میں بنایا نہ کہ مکہ میں اور اپنے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسحاقؑ ہیں نہ کہ حضرت اسماعیلؑ۔ اور پھر مروہ، مکہ اور بیت اللہ اور ان سے تعلق رکھنے والی ساری ہی چیزوں پر تحریف کی سیاہی پھیرنے کی کوشش کی لیکن آخر وہ آفتاب سے زیادہ روشن حقیقت کو کہاں تک چھپانے میں کامیاب ہوتے۔ اب بھی تورات میں، یہود کے علی الرغم، ایسی شہادتیں موجود ہیں جو ان کی سازش کا پردہ چاک کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف 'الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح' میں یہود کی ان ساری سازشوں کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے اور ہم بھی اس کتاب

میں تمام ضروری مباحث سے تعرض کر رہے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۲۔۱۴۱ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

قریش کے سامنے تاریخ کا آئینہ: 'اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـًٔا وَّطَهِّرۡ بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ'۔ بعینہٖ یہی مضمون کم و بیش الفاظ میں، سورۂ بقرہ میں یوں بیان ہوا ہے:

وَعَهِدۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ (بقرہ:۱۲۵)

اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ آیت ایک آئینہ ہے تاکہ قریش اس میں یہ دیکھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس مقصد اور کس حکم و ہدایت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کو اس گھر کی تعمیر پر مامور فرمایا تھا اور اب اس کو قریش نے کیا بنا کے رکھ دیا ہے، پھر بھی اس کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور ان لوگوں کو اس سے روک رہے ہیں جو اس گھر کے اصلی مقاصد کی از سر نو تجدید کرنا چاہتے ہیں۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾

ترجمہ

اور لوگوں میں حج کی منادی کرو، وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو پہنچیں گی دور دراز گہرے پہاڑی رستوں سے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'رِجَال' 'راجل' کی جمع ہے جس کے معنی پیادہ چلنے والوں کے ہیں۔ 'ضَامِر' اس اونٹ یا اونٹنی یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو طویل سفر سے لاغر ہو گیا ہو۔ یہ لفظ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ 'کل' اس کے ساتھ صفت کی تاکید کے طور پر ہے۔ مثلاً کہیں گے 'هو العالم كل العالم' (وہ نہایت جید عالم ہے) 'فجّ' پہاڑوں کے درمیان کے راستہ کو کہتے ہیں اور 'عمیق' اس کی صفت ہے۔ پہاڑی راستے چونکہ تنگ ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ کثرت آمد و رفت سے گہرے ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی حج کے لیے منادیٔ عام: یعنی حضرت ابراہیمؑ کو اس گھر سے متعلق ایک ہدایت تو وہ ہوئی تھی جو اوپر کی آیت میں مذکور ہوئی دوسری ہدایت یہ ہوئی تھی کہ وہ اس گھر کے حج کے لیے لوگوں میں منادی عام کریں کہ لوگ دور قریب سے اس سرچشمۂ خیر وبرکت سے مستفید ہونے کے لیے آئیں۔ اس میں بھی قریش کے رویہ پر تعریض ہے کہ ان کو کرنا تو یہ تھا کہ تمام خلق کو اس گھر کے حج وزیارت کی دعوت دیتے لیکن انھوں نے اس کے برعکس کیا یہ ہے کہ اس پر مارگنج بن کر بیٹھ گئے ہیں اور ملت ابراہیمؑ کے اصلی پیرو جب اس گھر کا قصد کرتے ہیں تو یہ ان پر پھنکارتے اور ان کو ڈستے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت: 'یَاْتُوْكَ رِجَالًا..الایۃ' یہ جواب امر ہے اس وجہ سے یہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت ہے کہ جب تم حج کی منادی کروگے تو لوگ پیادہ اور سوار والہانہ اس گھر کے حج کے لیے آئیں گے۔ لوگوں کے اونٹ طویل سفر سے لاغر اور مکہ کے راستے کثرت آمد وشد سے گہرے ہو جائیں گے۔

حج پر پابندیاں ناروا ہیں: ان استعارات سے آنے والوں کی جس کثرت، جس شوق و عشق، جس وارفتگی و ازخود رفتگی کا اظہار ہو رہا ہے اس کی شہادت آج ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی مکہ اور مدینہ کی سڑکیں اور منیٰ و عرفات کے میدان حج کے موقعے پر دے رہے ہیں اور ہر دیکھنے والا اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بشارت دی گئی تھی وہ کس طرح ظہور میں آئی اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں کس طرح برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے اس راہ عشق میں صرف اونٹنیاں لاغر ہوتی تھیں۔ اب زمانہ کی ترقی نے اس دوڑ میں بسوں، لاریوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کو بھی شریک کر دیا ہے۔ ان آیات کا سیاق اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پسند اور اس کی رضا یہی ہے کہ اس کے گھر کی زیارت کے لیے اس کے بندوں کے اندر یہ ذوق و شوق روز افزوں رہے اس وجہ سے بہت سی حکومتوں نے، اور وہ بھی مسلمان کہلانے والی حکومتوں نے حج پر ویزے، کوٹے، قرعے اور زر مبادلہ کے مختلف ناموں سے جو پابندیاں عاید کر رکھی ہیں یہ نہ صرف بالکل ناروا ہیں بلکہ ہمارے نزدیک 'صد عن المسجد الحرام' کے حکم میں داخل ہیں۔ کوئی غیر مسلم حکومت بھی اگر اپنے علاقے کے مسلمانوں پر اس قسم کی کوئی پابندی عاید کرے تو وہ اس کی مجاز نہیں ہے بلکہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا کہ یہ چیز اس فتنہ (PERSECUTION) کے حکم میں داخل ہے جس کو مٹانے کے لیے اس غیر مسلم حکومت کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کرنا چاہیے اگر وہ اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔

لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾

ترجمہ:

تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں، ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

حج کی دنیوی برکات: 'لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ' بقرہ کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ حج کے مہینے اہل عرب کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے بھی موسم بہار کا حکم رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں باہر سے اہل مکہ کی ضرورت کی تمام چیزیں مکہ کے بازاروں میں پہنچتی تھیں اور مکہ کا مال باہر کی منڈیوں کے لیے نکلتا تھا۔ اگر حج کے اصل مقصود کے ساتھ ساتھ اس قسم کے جائز دنیوی منافع حاصل کیے جائیں تو یہ چیز اس دین قیم کے مزاج کے منافی نہیں ہے جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہے بلکہ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ یہ دین فطرت رہبانیت کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اس عبادت میں بھی دین و دنیا کی باہم آمیزی کا اعتدال قائم رکھا ہے جس میں بظاہر سب سے زیادہ ترک دنیا کی نمود ہے۔ بس اصل چیز صحیح توازن کو قائم رکھنا ہے کہ حج صرف تجارتی یا سیاسی سفر بن کے نہ رہ جائے۔

'وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ'۔ 'بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ' کی تحقیق مائدہ آیت ا کے تحت گزر چکی ہے۔

'ایام معلومٰت' سے مراد: 'اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ' سے مراد قربانی کے معین ایام ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح اس دنیا کے کاموں میں اوقات، فصلوں اور موسموں کا اعتبار ہے، اگر اس کو قائم نہ رکھا جائے تو ساری جدوجہد اکارت ہو کے رہ جاتی ہے اسی طرح عبادات میں بھی مقام، اوقات ایام اور مہینوں کا اعتبار ہے۔ اگر ان کا حتی الامکان اہتمام نہ رکھا جائے تو عبادات اپنی اصلی برکت سے محروم رہ جاتی ہے۔ قربانی کے جو دن ہیں یہ اللہ و رسول کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور

یہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار ہیں۔ ان میں امت کی سہولت کو پیش نظر رکھ کر اللہ و رسول نے ایک حد خاص تک وسعت بھی رکھی ہے۔ اس وسعت سے فائدہ اٹھانا تقویٰ کے منافی نہیں ہے لیکن ان ایام کا اعتبار دین میں ضروری ہے اور یہ چیز اس کائنات کی فطرت کے بالکل مطابق ہے۔

چوپایوں کی جانوں پر اللہ کے نام کا قفل: 'وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ' اس آیت میں بھی اور آگے کی آیات میں بھی ذبح اور نحر کو 'ذکر اسم اللّٰہ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس اہتمام خاص کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت میں مشرکین کی تمام قربانیاں ان کے اصنام کے لیے ہوتی تھیں۔ اس فتنہ کے کلی سدباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام چوپایوں کی جانوں پر اپنے نام کا قفل لگا دیا جو صرف اسی کے نام کی کنجی سے کھولا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر کسی چوپایہ کی جان لینا دین میں حرام ٹھہرا۔ 'عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ' اس بات کی دلیل ہے کہ کیوں چوپایوں کو خدا ہی کے نام پر ذبح کرنا ضروری ہے؟ یہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ خدا ہی کے عطا کردہ ہیں اس وجہ سے کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کرنا خدا کی بھی ناشکری ہے اور جانوروں کی بھی تحقیر ہے۔ اس اسلوب میں اللہ تعالیٰ کے شکر کی ترغیب و تشویق بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کو چوپائے اپنے فضل و رحمت سے عطا فرمائے ہیں ان کا حق یہ ہے کہ بندے اس نعمت کے شکر کے طور پر ان کا نذرانہ اپنے رب کے حضور میں پیش کریں۔

مشرکین کے بعض تصورات کا خاتمہ: 'فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ' فرمایا کہ یہ قربانی جو تمھیں پیش کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے وہ اس لیے نہیں کہ خدا کو ان قربانیوں سے کوئی نفع پہنچتا ہے۔ خدا کو ان قربانیوں کا گوشت یا خون کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ تمھاری پیش کی ہوئی یہ چیز تمھی کو لوٹا دی جاتی ہے۔ تم خود اس کو کھاؤ اور بھوکوں اور محتاجوں کو کھلاؤ۔ قربانی کی مثال بالکل یوں ہے کہ کوئی اپنے سر کے تاج کو اصل بادشاہ کے قدموں پر رکھے اور بادشاہ اس تاج کو اپنے قدموں سے عزت دے کر پھر اس کے سر پر پہنا دے ۔۔۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرک قومیں بلا استثناء یہ تصور رکھتی ہیں کہ ان کے معبود ان کی پیش کردہ قربانیوں سے بہرہ اندوز و لذت یاب ہوتے ہیں۔ مشرکین تو درکنار یہود تک کے یہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ خداوند بعض قربانیوں کی خوشبو سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں بھی اور آگے کی آیات میں بھی ان تصورات کا خاتمہ کر دیا ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

ترجمہ

پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت قدیم کا طواف کریں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

حج کے آخری مراسم: 'تفث' کے معنی میل کچیل کے ہیں۔'قضی تفثہ' 'ای ازالہ' اس نے اپنا میل کچیل دور کیا۔ یہ قربانی سے فارغ ہونے کے بعد حج کے آخری مراسم کی ادائیگی کی طرف اشارہ ہے۔ احرام کی پابندیوں اور مناسک کی سرگرمیوں کی وجہ سے بال وغیرہ بھی بڑھ جاتے ہیں اور جسم کا میل کچیل بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی بات پسند ہے کہ ان ایام میں بندے پر یہی خستہ حالی و پراگندہ بالی کی حالت طاری رہے، لیکن حج کے بعد حجامت بنوائے، نہائے دھوئے، کپڑے بدلے اور اگر کوئی قربانی وغیرہ نذر امانی ہے تو وہ پوری کرے اور بیت اللہ کا آخری طواف کر کے حج سے فارغ ہو جائے۔

بیت عتیق: 'بیت اللہ' کو یہاں 'بیت عتیق' سے تعبیر فرمایا ہے۔'عتیق' کے معنی اصل اور قدیم کے ہیں۔ 'بیت اللہ' کو 'عتیق' کہنے کی وجہ، جیسا کہ ہم بقرہ ۱۲۵ کے تحت واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ خدا کا اصل اور قدیم گھر یہی ہے نہ کہ بیت المقدس، جیسا کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں۔ بیت المقدس اول تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد، حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں تعمیر ہوا ہے۔ پھر اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ اس کی اصل قربان گاہ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف تھا، اس لیے کہ تمام ذریت ابراہیم کا اصل قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ اگرچہ یہود نے ان تمام چیزوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن اصل حقیقت کے شواہد تورات میں آج بھی موجود ہیں اور بقرہ کی تفسیر میں ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔

ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ ۗ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ۖ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ﴿٣٠﴾

ترجمہ

ان امور کا اہتمام رکھو! اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور تمہارے لیے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیے گئے ہیں تو بتوں کی گندگی سے اجتناب رکھو اور جھوٹ بات سے بچو۔'

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'ذٰلِکَ' پورے جملہ کا قائم مقام: 'ذٰلِکَ' جب اس طرح آتا ہے تو یہ پورے جملہ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی یہ باتیں ہیں جو بیت اللہ اور اس کے حج و مناسک سے متعلق ابراہیمؑ کو بتائی گئی تھیں، ان کو اچھی طرح سن اور سمجھ لو۔ یہ گویا تنبیہ کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس جملہ پر پوری ہوئیں۔ اب آگے ان لوگوں کو ہدایات دی جارہی ہیں جو بیت اللہ کی وراثت کے مدعی تو تھے لیکن اس امانت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے خبر تھے۔

تمام حرماتِ الٰہی کے احترام کی ہدایت: 'وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ'۔ 'حُرُمٰتِ اللّٰهِ' سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کے احترام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ مثلاً حرم، مسجد حرام، اشہر حرم، ہدی اور قلائد وغیرہ۔ ان تمام چیزوں کے احترام کی روایت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ یہاں ان تمام چیزوں کی تعظیم و تکریم کی تاکید کی خاص وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے حضرت ابراہیمؑ کی تمام مقدس روایات اپنے دنیوی مفادات کی خاطر بالکل بدل ڈالی تھیں۔ مثلاً چار محترم مہینوں ہی کو لیجیے۔ ان کو نسی کا قاعدہ ایجاد کر کے، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے، قمری کے بجائے شمسی مہینوں کے مطابق کر لیا گیا تھا تاکہ تجارتی پہلو سے ان کو سازگار بنایا جاسکے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ حرمات الٰہی کے احترام کی پابندیوں کے سبب سے ہو سکتا ہے کہ بظاہر بعض دنیوی مفادات کو کچھ نقصان پہنچے۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ اشارہ ہے ان تفصیلات کی طرف جو سورۂ انعام میں گزر چکی ہیں۔ ملاحظہ ہوں سورۂ انعام کی آیت ۱۳۶۔۱۵۳۔ یہ ساری تحریم و تحلیل چونکہ مشرکانہ عقائد و توہمات پر مبنی تھی اس وجہ سے فرمایا کہ اپنے بتوں کے تعلق سے جو گندگی تم نے اپنے اوپر لاد رکھی ہے اس سے بچو۔ 'وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ' اور خدا کے اوپر جھوٹ افترا سے بچو۔ یعنی حرام و حلال تو تم اپنے جی سے کرتے ہو لیکن اس کو مذہبی تقدس کا درجہ دینے کے لیے منسوب خدا کی طرف کرتے ہو کہ اس نے تمھیں ان باتوں کا حکم دیا ہے۔ یہ نہایت سنگین جھوٹ اور اللہ تعالیٰ جل شانہٗ پر افتراء ہے، اس سے احتراز کرو۔ اسی چیز کو سورۂ انعام میں 'اِفۡتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'وَّحَرَّمُوۡا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افۡتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ' ۱۴۰

حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ﴿٣١﴾

ترجمہ

اللہ ہی کی طرف یکسو رہو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام شعائر کی تعظیم اور تمام مناسک کی ادائیگی اس طرح مطلوب ہے کہ ہر کام اس کی طرف یکسو ہو کر اور شرک کے ہر شائبہ سے بالکل پاک رہتے ہوئے کیا جائے۔ اگر کسی کام میں شرک کی کوئی آمیزش ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل باطل ہے۔

مشرک کی تمثیل: 'وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ... الآیۃ' یہ مشرک کی تمثیل بیان ہوئی ہے کہ آدمی شرک کا ارتکاب کر کے اپنے اصل مرکز سے کٹ جاتا ہے اور جب وہ اصل مرکز سے کٹ گیا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس شیطان کے ہتھے چڑھ جائے۔ وہ ایک بے لنگر کا جہاز ہے جو ہر چٹان سے ٹکرا سکتا ہے اور ایک کٹا ہوا پتنگ ہے جس کو ہوا جہاں چاہے اڑا لے جا سکتی ہے۔ توحید سے انسان کو جس درجے کی سرفرازی حاصل ہوتی ہے اس سے محروم ہوتے ہی وہ اسی درجے کی پستی میں گر جاتا ہے۔ فرمایا کہ جو اللہ کا شریک بناتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرا اور عقابوں نے اس کو اچک لیا یا ہوا نے اس کو کسی گہرے کھڈ میں لے جا کر پھینک دیا! یہ وقتی مفادات نہیں ہیں بلکہ ان کی اخروی برکتیں ہیں۔ جو لوگ ان اخروی برکتوں کی خاطر ہر حال میں ان کا احترام قائم رکھیں گے وہ یاد رکھیں کہ اللہ کے نزدیک یہ چیز ان کے لیے بہت بڑے خیر کا باعث ہو گی۔

مشرکین کے من گھڑت فتووں کی تردید: 'وَاُحِلَّتۡ لَـكُمُ الۡاَنۡعَامُ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ'۔ اوپر والا ٹکڑا جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بطور تنبیہ کے ہے۔ اب 'عَلٰى مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِيۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ' کے تعلق سے واضح فرمایا جا رہا ہے کہ مشرکین نے محض اپنے مشرکانہ توہمات کی بنا پر مختلف چوپایوں کے بارے میں یہ فتوے جو جاری کر رکھے ہیں کہ فلاں چوپایہ حلال ہے، فلاں حرام ہے، فلاں مردوں کے لیے جائز ہے اور فلاں عورتوں کے لیے ناجائز ہے، فلاں قسم کے چوپایہ پر سواری کرنا جائز ہے اور فلاں قسم کے چوپایہ پر جائز نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ ساری باتیں محض من گھڑت ہیں۔ ملت ابراہیمؑ میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ملت ابراہیمؑ میں حرام صرف وہی چوپائے ہیں جو قرآن میں پڑھ کر سنائے جا رہے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ شرک کا ارتکاب کر کے آدمی خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ خود اپنے ہی کو اس سرفرازی اور اس امن و حفاظت سے محروم کرلیتا ہے جو توحید کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشی ہے۔ پھر وہ شیطان کے ہر فتنہ کا ہدف اور اس کے بچھائے ہوئے ہر جال کا شکار ہے۔

ذٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴿٣٢﴾

ترجمہ

ان امور کا اہتمام رکھو! اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

شعائر کی تعظیم کے لیے اصل شرط: یہ 'ذٰلِکَ' بھی اسی طرح کا ہے جیسا کہ اوپر آیت ۳۰ میں گزرا۔ یعنی اوپر جو باتیں بتائی گئی ہیں ان کو اچھی طرح سن لو اور ان کو گرہ کرو اور مزید برآں یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ اللہ نے جو شعائر مقرر فرمائے ہیں ان کی تعظیم کا حق محض ظاہر داری سے ادا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔ شعائر، جیسا کہ ہم بقرہ۔ ۱۵۸۔ 'اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ' کے تحت واضح کر چکے ہیں کسی عظیم حقیقت کے نشان اور مظہر کے طور پر مقرر ہوئے ہیں۔ ان سے اصل مقصود انہی حقائق کی تذکیر و تذکر ہے جو ان کے اندر مضمر ہیں۔ اگر ان حقائق کا اہتمام باقی نہ رہ جائے تو محض ظاہری رسم داری سے شعائر کی تعظیم کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ان کی صحیح تعظیم کا حق اسی وقت ادا ہوتا ہے جب وہ اثر ان سے اخذ کیا جائے جس کو پیدا کرنے کے لیے وہ مقرر ہوئے ہیں۔ آگے قربانی سے متعلق، جو ایک عظیم شعیرہ ہے، اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (۳۷)

اللہ کو تمھاری ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچے گا اور نہ ان کا خون بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچے گا۔

قربانی کے متعلق معلوم ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ انھوں نے اپنے محبوب فرزند۔۔۔ حضرت اسماعیلؑ۔۔۔ کی قربانی کر کے اسلام کی اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ مسلم کو ہر وقت اپنی عزیز سے عزیز شے اپنے رب کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر قربانی کی یہ حقیقت مستحضر نہ رہے اور آدمی ایک جانور کی گردن پر چھری چلا دے تو گو فی الظاہر اس نے قربانی کر دی

لیکن فی الحقیقت وہ اس عظیم شعیرہ کی روح سے بے خبر رہا درآنحالیکہ خدا تک رسائی حاصل کرنے والی چیز وہ روح ہی ہے نہ کہ اس کی قربانی کا گوشت یا خون۔

لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٣٣﴾

ترجمہ

اور تمہارے لیے ان ہدی کے جانوروں میں ایک خاص وقت تک مختلف قسم کی منفعتیں ہیں پھر ان کو قربانی کے لیے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

لفظ 'محلّ' پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ص 439 پر بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے بعد حرف 'اِلٰی' اس بات کا قرینہ ہے کہ کوئی لفظ ایسا محذوف مانا جائے جس سے یہ مفہوم پیدا ہو کہ پھر ان کو بیت عتیق کے پاس لے جا کر قربان کرنا ہے۔

مشرکین کی بعض بدعات کی اصلاح: مشرکین جب کسی چوپایہ کو ہدی و نیاز کے لیے نامزد کر دیتے تو پھر اس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز سمجھتے۔ قرآن نے ان کی اصلاح فرمادی کہ ان شعائر کی تعظیم کے لیے یہ چیز ضروری نہیں ہے۔ اپنے قربانی کے جانوروں کو پالو وار ان سے اس وقت تک فائدہ اٹھاؤ جب تک ان کی قربانی کا وقت نہ آجائے۔ اس انتفاع سے ان کی حرمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ یہ ضروری ہے کہ جب ان کی قربانی کا وقت آجائے تو ان کو اللہ کے قدیم گھر کے پاس لے جا کر اللہ ہی کے لیے ان کو قربان کرو۔ اگر کسی اور تھان یا استھان پر لے کر ان کو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا تو اس سے ان کی حرمت برباد ہو جاتی ہے۔ 'بَیۡتِ عَتِیۡق' کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے۔ 'ثُم' یہاں میرے نزدیک ترتیب کو ظاہر کرتا ہے اس وجہ سے میں اس انتفاع کو اس وقت تک جائز سمجھتا ہوں جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾

ترجمہ

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی تا کہ اللہ نے ان کو جو چاپائے بخشے ہیں ان پر وہ اس کا نام لیں۔ پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو۔ اور خوش خبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

قربانی ایک قدیم ترین طریقۂ عبادت: لفظ 'منسک' کی تحقیق بقرہ آیت 200 کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے قربانی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرائع الٰہی میں قربانی ایک قدیم ترین عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی امت کے لیے اس طریقۂ عبادت کو مشروع فرمایا کہ اللہ کے بندے اس طرح اللہ کے بخشے ہوئے چوپایوں پر اس کی شکر گزاری کا حق ادا کریں۔ یہاں قربانی کے قدیم ترین طریقۂ عبادت ہونے کی جو ذکر ہے اس کی شہادت کے لیے یہ کافی ہے کہ تورات اور قرآن دونوں میں حضرت آدمؑ کے بیٹے ہابیل کی قربانی کا ذکر موجود ہے۔

'لِّيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِيۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ'۔ خدا کی مشروع کی ہوئی اس عبادت کی یہ خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ اللہ نے یہ عبادت خاص اپنی شکر گزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے کہ اس کے عطا کیے ہوئے چوپائے اس کی خوشنودی اور رضا طلبی کے لیے لوگ اس کے حضور میں نذر گزرانیں اور اس طرح اس کی بخشی ہوئی نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام ادیان الٰہی میں قربانی کی مشروعیت اور اس کی اصل روح یہ رہی ہے۔ اس میں اگر کسی غیر اللہ کو شریک بنایا گیا ہے تو یہ مبتدعین کی پیدا کردہ ضلالت ہے۔ اللہ کے دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

'فَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسۡلِمُوۡا'۔ مطلب یہ ہے کہ معبود تم سب کا ایک ہی ہے تو اس کی قربانی و رعبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ بناؤ بلکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو۔ یہی حوالگی قربانی کی اصل روح ہے۔

'اخبات' کی حقیقت: 'وَبَشِّرِ الۡمُخۡبِتِيۡنَ'۔ 'خبت' پست اور نشیبی زمین کو کہتے ہیں۔ اسی سے 'اخبات' ہے جس کے معنی فروتنی اور تذلل و تواضع کے اظہار کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے اسی حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے جس کی ہدایت 'اَسۡلِمُوۡا' کے لفظ سے ہوئی ہے۔ اسلام کی اصل روح 'اخبات' ہی ہے یعنی انسان کا صرف ظاہر ہی نہیں بلکہ اس کا دل بھی اپنے پروردگار کے آگے جھک جائے۔ جن لوگوں کے اندر یہ اخبات ہو حقیقی مومن و مسلم وہی ہیں اور انہی کے لیے خدا کے رضوان اور اس کی جنت کی بشارت ہے۔

الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾

ترجمہ

جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے، ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے اس پر صبر کرنے والے، نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یہ 'مخبتین' کی صفت ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور اس کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ مستکبرین کی طرح، جن کا ذکر اسی سورہ میں آگے آیت 72 میں آئے گا، ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ ان کے دل خشیت الٰہی سے دہل جاتے ہیں۔ 'وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ' اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں ہر مصیبت کو پوری ہمت کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں، ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جن کا حال آیت 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ' کے تحت بیان ہوا کہ وہ ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے ہیں لیکن اس راہ میں کوئی چوٹ کھانے اور کوئی جوکھم برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ 'وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ' یہ مضاف الیہ کی ترکیب ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ برابر نماز کا نہایت اہتمام رکھنے والے ہیں۔ 'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' اور خدا نے جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس اسلوب میں انفاق کی تسہیل اور اس کی ترغیب کا جو پہلو ہے اس پر بھی نگاہ رکھیے اور نماز اور انفاق میں جو رشتہ ہے اس کو بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیجیے۔ دن کی حکمت سمجھنے کے لیے ان اجزاء کے باہمی تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٣٦﴾

ترجمہ

اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر الٰہی میں سے ٹھہرایا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بڑے خیر ہیں تو ان پر اللہ کا نام لو ان کو صف بستہ کر کے۔ پس جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور کھلاؤ قانع محتاجوں اور سائلوں کو۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تا کہ تم خدا کے شکر گزار رہو۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'بُدْنَ' کا مفہوم: 'بدن' 'بدنۃ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ اونٹوں کے لیے آتا ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر ان اونٹوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو قربانی کے لیے نامزد کر دیے گئے ہوں اور جن کی حیثیت ہدی اور قلائد کی ہو چکی ہو۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ 'جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ' (ان کو ہم نے تمھارے لیے شعائر میں سے ٹھہرایا ہے) ظاہر ہے کہ شعیرہ ہونے کا درجہ ہر اونٹ اور اونٹنی کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف نیاز کے اونٹوں کو حاصل ہوتا ہے۔

اونٹوں کے ذکر کی ایک خاص وجہ: اوپر آیت ۲۸ میں ان تمام چوپایوں کا ذکر ہو چکا ہے جن کی قربانی مشروع ہے۔ اس کے بعد اونٹوں کے ذکر کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی اس لیے کہ 'بھیمۃ الانعام' میں یہ بھی شامل ہیں لیکن ایک خاص سبب سے ان کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا۔ وہ یہ کہ اونٹ اہل عرب کے محبوب چوپایوں میں سے ہے، لیکن یہود نے، اپنی ایک کمزور روایت کی بنا پر، جس کا ذکر آل عمران ۹۳ کے تحت ہو چکا ہے، اس کو حرام قرار دے رکھا تھا۔ اپنی اسی روایت کی آڑ لے کر انھوں نے اونٹ کی قربانی کے مسئلہ کو بھی اسلام کے خلاف فتنہ انگیزی اور وسوسہ اندازی کا ذریعہ بنا لیا۔ انھوں نے یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ نیا دین حضرت ابراہیمؑ کا دین کس طرح ہو سکتا ہے جس نے تمام انبیاءؑ کے حرام کیے ہوئے جانور کی قربانی کو خدا کے تقرب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ قرآن نے آل عمران کی آیت ۹۳ میں یہود کے اس واہمہ کی تردید فرمائی ہے اور یہود سے مطالبہ کیا ہے کہ اگر اس بات کا ان کے پاس کوئی ثبوت موجود ہو کہ اونٹ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حرام قرار دیا ہے تو وہ اس کو پیش کریں۔

'لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ' یہ اونٹ کی قربانی کو شعائر الٰہی میں سے قرار دیے جانے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ اس کے اندر تمھارے لیے بڑی برکتیں اور بڑے فوائد ہیں۔ آیت 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ' کے تحت ہم عرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو قربانی اسی جانور کی پسند ہے جو عزیز و محبوب ہو۔ اونٹ عرب کے محبوب ترین جانوروں میں سے ہے۔ یہ ان کے صحرا کا سفینہ، ان کے تمام سفر و حضر کا رفیق اور ان کی تمام تجارتی سرگرمیوں کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اس کے دودھ، گوشت اور کھال ہر چیز سے بیش از بیش فائدے اٹھاتے تھے۔ قرآن نے اس کی

انہی منفعتوں اور برکتوں کے سبب سے اہل عرب کو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی اس نعمت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز باعتبار دنیا اہل عرب کے لیے اتنی نفع بخش اور بابرکت ہو اگر وہ اس کو اپنے رب کی خوشنودی کے لیے قربان کریں تو یہ ان کے لیے خدا کے تقرب کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

اونٹوں کی قربانی کی طریقہ: 'فَاذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتۡ جُنُوۡبُهَا فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَالۡمُعۡتَرَّ'۔ یہ ان کی قربانی کا طریقہ بتایا کہ ان کو قبلہ رو صف بستہ کھڑے کر کے ان کو نحر کرو۔ نحر یا ذبح کو ذکر اللہ سے تعبیر کرنے کی وجہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یہ صف بستہ کھڑا کرنا گویا خدا کے حضور نماز کے لیے ان کا قیام ہے اور نحر کے بعد جب وہ اپنے پہلو پر گر پڑیں تو یہ گویا رب کے حضور ان کا سجدہ ہے۔ فرمایا کہ اس کے بعد تم خود بھی اس کے گوشت سے فائدہ اٹھاؤ اور خود دار محتاجوں اور سائلوں کو بھی کھلاؤ۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اپنی قربانیوں سے کوئی فائدہ اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس بدعت کی بھی اصلاح کر دی۔

'قانع' اور 'معتر' کی وضاحت: یہاں مستحقین کے لیے 'قانع' اور 'معتر' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اصل مستحق تو، جیسا کہ اوپر آیت ۲۸ میں گزرا، نادار و غریب لوگ ہیں لیکن غریبوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کی خودداری سوال کرنے کا ننگ گوارا نہیں کرتی اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو سوال کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے ناداروں کے لیے 'قانع' کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور دوسری قسم کے ناداروں کے لیے 'معتر' کا۔ 'معتر، متعرض للسوال' کو کہتے ہیں۔ آیت میں 'قانع' کی تقدیم سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا حق مقدم ہے اور چونکہ وہ سائل بن کر کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے اس وجہ سے دینے والوں کا فرض ہے کہ خود ان کے پاس پہنچیں، ان سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ دینے والوں کے پاس پہنچیں گے۔ آیت 'لَا يَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا' کے تحت اس مسئلہ پر وضاحت سے ہم لکھ چکے ہیں اور یہ اشارہ بھی کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غرباء کے لیے پسندیدہ رویہ خودداری ہی کا رویہ ہے۔ اگرچہ مجبوری کی حالت میں سوال کرنے کی بھی اجازت ہے۔

'كَذٰلِكَ سَخَّرۡنٰهَا لَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ' مطلب یہ ہے کہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اونٹ جیسے عظیم جانور کی نکیل اس طرح تمھارے ہاتھ میں پکڑا دی ہے کہ تم اپنے سفر و حضر میں جس طرح چاہو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور جب چاہو اس کو نحر کر دو۔ وہ تمہاری اطاعت سے سر مو انحراف نہیں کر سکتا۔ اگر خدا نہ چاہتا تو اونٹ تو درکنار کسی چھوٹے سے چھوٹے جانور کو بھی تم اس طرح اپنا

تابع فرمان نہیں بنا سکتے تھے۔ خدا کے اس احسان کا قدرتی اور فطری حق یہی ہے کہ تم اس کے شکر گزار رہو، اس کے حقوق برابر ادا کرو اور ان حقوق میں دوسروں کو ساجھی نہ ٹھہراؤ۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٧﴾

ترجمہ

اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم اللہ کی ہدایت بخشی پر اس کی تعظیم بجالاؤ۔ اور خوب کاروں کو خوش خبری سنا دو۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اصل حقیقت کی یاددہانی: یہ اسی حقیقت کی دوسرے پہلو سے یاددہانی ہے جس کی طرف اوپر آیت 32 میں اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا قربانیوں کے گوشت یا خون سے محظوظ نہیں ہوتا، جیسا کہ مشرکین نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اس تقویٰ اور اس اسلام و اخبات سے خوشنود ہوتا ہے جو ان قربانیوں سے ان کے پیش کرنے والوں کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ قربانیاں پیش کرتے ہوئے اپنے اندر تقویٰ کی یہ روح پیدا کرو۔ اگر یہ چیز نہ پیدا ہوئی تو یہ محض ایک جانور کا خون بہا دینا ہوا، اس کا حاصل کچھ نہیں۔

'كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ' یہ اسی مضمون کا دوسرے لفظوں میں اعادہ ہے جو اوپر 'كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا .. الآیہ' میں گزرا۔ البتہ اس میں اس شکر کا طریقہ بتا دیا کہ یہ خدا کی تکبیر و تہلیل کی صورت میں ہو یعنی اس نذرانہ کو خدا کی بارگاہ میں پیش کرتے ہوئے صرف خدا ہی کی عظمت و کبریائی کا اعتراف و اعلان کیا جائے، کسی غیر خدا کو اس میں ساجھی نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں ان چوپایوں کو قبلہ رو کر کے ان پر تکبیر پڑھی جاتی اور 'منک ولک' کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مزید برآں اس آیت میں اس شکر کے اصل محرک کا بھی پتہ دے دیا ہے کہ یہ شکر اس بات کا ہے کہ خدا نے تمہیں ہدایت بخشی یعنی اس اسلام و اخبات کی ہدایت بخشی جس کا اظہار حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کر کے کیا۔

'وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ'۔ 'محسن' کا مفہوم ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ خوب کار لوگ ہوتے ہیں جو خدا کے ہر حکم کی تعمیل اس کو حاضر وناظر جان کر اس طرح انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح اس کو انجام دینا چاہیے۔ یہاں بربنائے قرینہ یہ مضمون محذوف ہے کہ جو لوگ ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی قربانی پیش کریں گے وہی لوگ دراصل خوب کار ہیں۔ایسے خوب کاروں کو خدا کی خوشنودی اور اس کی جنت کی خوش خبری پہنچادو!

آگے کا مضمون ——— آیات ۳۸ – ۴۱

یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں اور چونکہ یہ، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں ، انہی باتوں پر متفرح اور انہی کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔اس وجہ سے ان کو مصحف کی ترتیب میں یہاں جگہ ملی۔

اوپر آیت ۲۵ پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔وہاں ، قریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ارشاد ہو ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ اور مسجدِ حرام سے مسلمانون کو روک رہے ہیں ، در آنحالیکہ مسجد حرام پر کسی کی اجارہ داری قائم نہیں ہوسکتی ، وہ بڑے ہی ظالم ہیں اور اللہ ایسے ظالموں کو ایک دردناک عذاب چکھائے گا۔اس کے بعد بیت اللہ کی تاریخ اور اس کے مناسک و شعائر کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ قریش نے اس گھر کی ساری حرمت برباد کر کے رکھ دی ہے۔ان کو ئی حق نہیں ہے کہ وہ اس گھر پر مسلط رہیں۔

ان آیات کے اندر ظاہر ہے کہ یہ اشارہ مضمر تھا کہ اس گھر کی تولیت کے اصلی حقدار مسلمان ہین نہ کہ قریش لیکن مکہ میں مسلمان بالکل بےبس اور مجبور تھے، اس وجہ وہ اپنےاس حق کو حاصل کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد جب انہوں ایک تنظیم کی شکل اختیار کر لی تو ان کے اندر قدرتی طور پر یہ احساس شدت سے پیدا ہوا کہ انہیں اس گھر کی برکتوں سے محروم نہیں رہنا چاہئیے۔لیکن اس کی شکل کیا ہو ؟ ظاہر ہے کہ جب قریش نے اس بے دردی کے ساتھ ان کو اس گھر سے نکال چھوڑا تھا تو وہ آسانی سے یہ گوارہ نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کو حج اور عمرہ کی اجازت دیں۔اگر مسلمان اس کی کوشش کرتے تو لازماً جنگ کی نوبت آجاتی۔اور جنگ بھی حدودِ حرم اور اشہر حرم میں، جس کوجاہلیت اور اسلام دونوں میں مبغوض سمجھا گیا ہے۔ قریش اور ان کے حلیف

۔۔۔۔اہلِ کتاب۔۔۔۔اس چیز کو بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کا ذریعہ بناتے کہ دیکھو اس نئے دین والوں نے حرم اور اشہر حرم کی حرمت پر بھی حملہ کردیا جس کی جسارت ان سے پہلے کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ یہ سارے مسائل اس وقت مسلمانوں کے سامنے تھے۔ان آیات میں انہی سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾

ترجمہ

بے شک اللہ مدافعت کرے گا ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ اللہ ہر گز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مظلوم مسلمانوں کے لیے بشارت: اس بحث کی تمہید ہی اللہ تعالیٰ نے مظلوم مسلمانوں کے لیے بشارت سے اٹھائی ہے۔ فرمایا کہ قریش نے ہمارے باایمان بندوں پر جو ظلم ڈھایا ہے اس میں اپنے مظلوم بندوں کی مدافعت ہم کریں گے۔ یعنی اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت و مدافعت کے لیے اٹھیں، خدا اس جہاد میں ان کے ساتھ ہوگا اور ہر قدم پر ان کی نصرت فرمائے گا۔

قریش سے اعلان براءت: 'اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ'۔ 'کُلَّ' یہاں میرے نزدیک تاکید صفت کے لیے ہے اور 'خَوَّانٍ کَفُوْرٍ' سے اشارہ کفار قریش کی طرف ہے۔ 'خَوَّانٍ' کے معنی، خائن، غدار اور عہد شکن کے ہیں۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انھوں نے وہ تمام عہود و شرائط پامال کردیے ہیں جن کے تحت ان کو حرم کی پاسبانی سپرد ہوئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جن مقاصد کے لیے اس گھر کو تعمیر کای تھا اور اپنی ذریت پر اس گھر سے متعلق جو ذمہ داری ڈالی تھی ان میں سے ایک ایک چیز کی انھوں نے آبرو مٹا دی۔ اس وجہ سے یہ اس گھر کی تولیت کے حق دار نہیں ہیں اور ایسے غداروں اور خائنوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

'خَوَّانٍ' کے ساتھ 'کَفُوْرٍ' کی صفت ان کی ناسپاسی وناشکری کے بیان کے لیے ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم وضاحت سے بیان کرچکے ہیں کہ قریش کو پورے عرب میں مذہبی پیشوائی اور سیاسی اقتدار کا جو مقام بلند حاصل ہوا تو تمام تر بیت اللہ کی بدولت حاصل ہوا لیکن وہ بجائے اس کے کہ اس نعمت کی قدر کرتے اور اپنے رب کے شکر گزار رہتے اس گھر پر اپنی اجارہ داری قائم کرکے اس کے نام پر حقوق تو سارے حاصل کرتے رہے لیکن خود اس کے حقوق و فرائض نہ صرف یہ کہ بالکل بھول بیٹھے بلکہ ان کے بالکل برعکس اقدامات سے اس

گھر کی ساری عزت انھوں نے خاک میں ملادی۔ فرمایا کہ ایسے غداروں اور ناشکروں سے خدا کو کیا تعلق! اللہ ایسے خائنوں اور ناسپاسوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ 'لَا یُحِبُّ' سے مقصود یہ ہے کہ خدا ایسے بدعہدوں کو مبغوض رکھتا ہے۔ ان کو جتنی مہلت ملنی تھی وہ مل چکی۔ اب وقت آگیا ہے کہ خدا اپنے حرم کو ان ناپاکوں سے پاک کرے اور اپنے ان بندوں کو اس کی تولیت سپرد کرے جو اس ابراہیمی امانت کا حق ادا کریں۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

ترجمہ

جن سے جنگ کی جائے ان کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی بوجہ اس کے کہ ان پر ظلم ہوا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مسلمانوں کو اپنی مدافعت میں جہاد کی اجازت: 'اُذِنَ' کا متعلق یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی اب ان مسلمانوں کو جن سے جنگ کی جائے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس وقت تک چونکہ مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ تنظیمی ہیئت نہیں تھی اس وجہ سے ہر قسم کے مظالم کے ہدف رہنے کے باوجود ان کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ صبر کی ہدایت فرمائی گئی۔ اس لیے کہ منتشر افراد کی جنگ فساد کو مٹا کر حق و عدل قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور اسلام میں جنگ صرف حق و عدل کے قیام ہی کے لیے جائز ہے لیکن مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد حالات تبدیل ہو گئے اس وجہ سے ان کو اپنی مدافعت میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دے دی گئی۔ علاوہ ازیں یہ اجازت اس پہلو سے بھی ضروری تھی کہ معاملہ حرم اور حدود حرم کا تھا۔ مسلمان حرم کے معاملے میں کوئی اقدام اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک اللہ و رسول کی طرف سے ان کو اس کے لیے اجازت نہ ملے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت مذکور ہے اس لیے کہ اس مرحلے تک مسلمان ابھی اس سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے لیے جارحانہ جنگ بھی جائز ہے یا نہیں تو اس سوال کے جواب کے لیے ہماری تفسیر سورۂ براءت کا تدبر سے مطالعہ فرمائیے۔

'بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا' یہ اس اجازت کے حق میں ایک مزید وجہ کا حوالہ ہے۔ یعنی اول تو اپنا دفاع ہر شخص اور ہر جماعت کا حق ہے ہی، پھر مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ ان مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ اس ظلم کی تفصیل آگے والی آیت میں آرہی ہے۔

'وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُ' یہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا وعدۂ مدافعت کی توثیق بھی ہے اور کفار قریش کے لیے ایک قسم کی تہدید بھی۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے اور کوئی ان کی مدد کر کے ان کو کیا تقویت پہنچا سکتا ہے۔ اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے اور جب وہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے تو دنیا کی کوئی قوت بھی ان کو شکست نہیں دے سکتی۔

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾

ترجمہ

جو مظلوم اپنے گھروں سے بے قصور محض اس جرم پر نکالے گئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو، ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں، جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، ڈھائے جا چکے ہوتے۔ اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مسلمانوں کی مظلومیت کی وضاحت: 'اَلَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ'۔ یہ مسلمانوں کی اس مظلومیت کی وضاحت ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو بغیر کسی جرم کے ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے۔ اس اسلوب بیان میں وہ تمام مظالم و شدائد آپ سے آپ آگئے جن میں مسلمان مبتلا کیے گئے۔ اس لیے کہ کوئی اپنے وطن اور اپنے گھر در کو اس وقت تک چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک اس پر اس کے وطن کی سرزمین تنگ نہ کر دی جائے۔

'اِلَّآ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ' یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مظلوموں کا اگر کوئی جرم بنتا ہے تو یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب بس اللہ ہے! یعنی ان کی سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑے حق کی دعوت ان کا سب سے بڑا گناہ بن گئی ہے اور اس جرم میں ان کو اتنا تنگ کیا گیا ہے کہ ان غریبوں کو اپنے گھر در کو خیرباد کہنا پڑا۔

بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ قرآن یہاں کلمۂ توحید کو ایک مرنجاں مرنج قسم کے کلمہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ یہ کسی کے لیے کوئی چڑنے کی چیز تو ہے نہیں، کفار قریش خواہ مخواہ کو اس سے چڑ کر مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے۔ آخر اس سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے کہ کوئی صرف ایک ہی خدا کو مانے! جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے یہ محض ان کی خوش فہمی ہے۔ قریش ان لوگوں کی طرح اتنے بلید نہیں تھے کہ وہ اس کلمہ کے مضمرات کو نہ سمجھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی زد کہاں تک ہے اس وجہ سے وہ اس کے دشمن تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح وہ سب سے بڑے حق کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ قرآن نے ان کی اسی حماقت کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے اور نہایت لطیف انداز میں توجہ دلائی ہے۔

'وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا'۔

'صوامع' سے مراد: 'صوامع' 'صومعۃ' کی جمع ہے۔ اصلاً یہ لفظ ان بلند پہاڑوں اور مکانوں کے لیے آیا ہے جہاں عیسائی راہب عبادت کے لیے خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے تھے۔ اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ 'خانقاہیں' کیا جائے تو موزوں رہے گا۔

'بیع' سے مراد: 'بیع' 'بیعۃ' کی جمع ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ دونوں کے عبادت خانوں کے لیے آتا ہے۔ لیکن آگے یہود کے عبادت خانوں کے لیے الگ لفظ آیا ہے۔ اس وجہ سے اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ کے گرجے ہوں۔ ان کے ہاں رہبانیت کے نظام کی وجہ سے خانقاہوں اور گرجوں دونوں کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔

'صلوات' سے مراد: 'صلوات' 'صلاۃ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ یہود کے کنیسوں کے لیے آتا ہے۔ عبرانی میں اس کی اصل 'صلوتا' ہے۔

'مساجد': 'مساجد' مسلمانوں کی مساجد کے لیے معروف ہے۔

جہاد کی اجازت کی حکمت: اب یہ حکمت بیان ہو رہی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دی ہے یہاں تک کہ حرم اور حدود حرم میں بھی اگر ان پر حملہ ہو تو وہاں بھی ان کو حق ہے کہ وہ اپنی مدافعت کریں اور اپنے رب سے یہ امید رکھیں کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا۔ فرمایا کہ یہ اجازت اس وجہ سے دی گئی ہے کہ اگر اللہ اشرار و شیاطین کو اپنے

صالح بندوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، تمام گرجے، تمام کنیسے اور تمام مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب کب کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ چنانچہ ہمیشہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنے صالح بندوں کو جہاد کی ہدایت فرمائی اور انھوں نے جہاد کر کے تمام دینی اقدار اور شعائر کی حفاظت کی۔ اسی طرح آج مسلمانوں کو بھی یہ اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ اللہ کے حرم اور اس کے شعائر کی حفاظت کے لیے اٹھیں اور اگر اس کے موجودہ غاصب و غدار مدعیان تولیت ان کی راہ میں مزاحم ہوں تو وہ ان کا جواب ترکی بہ ترکی دیں۔

مخالفین جہاد کو جواب: یہ امر ملحوظ رہے کہ مسلمانوں کے اس حوصلہ کو بھانپ کر قریش نے پہلے ہی سے ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ اب یہ نئے دین والے حرم اور حدود حرم کی حرمت بھی باقی نہیں رہنے دینا چاہتے اور یہود و نصاریٰ بھی انھی کی لے میں لے ملا کر مسلمانوں کے اس جذبۂ جہاد کو دین داری کے خلاف قرار دے رہے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں بھی دین داری کے ان مدعیوں کو جواب دیا ہے اور یہاں بھی ان سب کو جواب دیا ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں جہاد دین داری کے خلاف ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کی ساری بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے اور مفسدین کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ دل کھول کے اپنے حوصلے پورے کر لیں۔

جہاد کے سب سے بڑے مخالف نصاریٰ تھے: یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ آیت میں سب سے پہلے، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، نصاریٰ کی خانقاہوں اور ان کے گرجوں کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے ان کی طرف اشارہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد پر سب سے زیادہ معترض، جیسا کہ سورۂ حدید کی تفسیر سے معلوم ہو گا، نصاریٰ ہی تھے۔ اگرچہ ان کی اس مخالفت کے محرکات بعض اور بھی تھے جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی لیکن ان کے رہبانی تصور کو اس میں بڑا دخل تھا۔ قرآن نے ان کے اسی تصور پر یہاں ضرب لگائی ہے کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں جو لوگ جہاد کو دین داری کے خلاف قرار دے رہے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ اگر دین داری کا یہی تصور پہلے بھی ہوتا تو آج زمین پر خدا کی عبادت کا ایک گوشہ بھی محفوظ نہ ہوتا۔

یہاں نصاریٰ اور یہود کے جن معابد کا حوالہ ہے ان کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ اصلاً ان کی حیثیت وہی تھی جو ہمارے ہاں مساجد کی ہے۔ ان میں خرابی اس وقت سے پیدا ہوئی ہے جب اہل کتاب شرک و بدعت میں مبتلا ہوئے۔

مسلمانوں سے وعدۂ نصرت سے متعلق بعض حقائق: 'وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ'۔ یہ اسی وعدۂ نصرت کو مزید مؤکد فرمایا ہے اور اس کے ساتھ بعض نئی حقیقتوں کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے جو نہایت اہم ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ خدا کے دین اور اس کے شعائر کی حفاظت کے لیے اٹھتے ہیں وہ درحقیقت اپنے رب کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کی مدد فرمائے جو اس کی مدد کے لیے اٹھے ہیں۔

دوسری یہ کہ خدا کی مدد ہمیشہ ان لوگوں کے لیے ظہور میں آتی ہے جو حق کی راہ میں خود اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کی مدد نہیں کرتا جو بنی اسرائیل کی طرح یہ چاہتے ہیں کہ خدا ان کے لیے میدان جیت کر تخت حکومت بچھا دے تب وہ جا کر اس پر براجمان ہو جائیں گے۔

خدا کے قوی و عزیز ہونے کے بعض خاص پہلو: 'اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ' میں بھی کئی پہلو ہیں۔

---۔ خدا قوی و عزیز ہے اس وجہ سے وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کی مدد کرتے ہیں وہ درحقیقت خود اپنے لیے خدا کی مدد کی راہ کھولتے ہیں۔

---۔ مسلمان اپنی قلت تعداد اور دشمن کی بھاری جمعیت سے ہراساں نہ ہوں، جو خداوند ذوالجلال ان کی پشت پناہی کا وعدہ کر رہا ہے وہ قوی و عزیز ہے۔

---۔ کفار مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ یہ چند چنے بھلا کیا بھاڑ پھوڑیں گے! یہی قطرے اب طوفان بنیں گے! اس لیے کہ ان کو خدا کی نصرت و حمایت حاصل ہے اور خدا قوی و عزیز ہے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٤١﴾

ترجمہ

یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

’الارض‘ سے مراد سرزمین حرم: ’الارض‘ سے مراد، جس طرح رعد۔ 41اور انبیاء۔ 44 میں ارض مکہ ہے اسی طرح قرینہ دلیل ہے کہ یہاں بھی اس سے مراد ارض مکہ ہے اس لیے کہ یہاں جس جہاد کی اجازت دی گئی ہے اصلاً اس کا تعلق ارض حرم ہی کی آزادی و تطہیر سے ہے۔ فرمایا کہ اس کے موجودہ غاصب اجارہ داروں نے تو اس حرم کے وہ تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی ذریت کو بسایا تھا البتہ اگر ہم اپنے ان بندوں کو اس سرزمین میں، اپنی تائید و نصرت سے، اقتدار بخشیں گے تو یہ اس کے تمام مقاصد کو از سرنو بروئے کار لائیں گے۔ یہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ بقرہ کی آیات 128-124 پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بعینہٖ یہی مقاصد ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو حضرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا مرکز بنایا تھا اور آیت کا اسلوب بیان خود اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ قریش نے یہ تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں۔

مسلمانوں کے اقتدار کے ثمرات: دنیا میں مسلمانوں کے اقتدار و تمکن کی پہلی بشارت یہی ہے جس کا آغاز حرم کی سرزمین سے ہوتا ہے، جس کی نسبت ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اس کی حیثیت ملت کے قلب کی ہے۔ اسی کے صلاح و فساد پر تمام ملت کے صلاح و فساد کا انحصار ہے۔ بعینہٖ یہی فریضہ مسلمانوں پر ہر اس سرزمین کے لیے عاید ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ ان کو اقتدار بخشے۔ اگر وہ یہ فریضہ ادا نہ کریں تو خدا کے نزدیک جس طرح دوسروں کا تسلط ناجائز ہے اسی طرح ان نام نہاد مسلمانوں کا تسلط بھی ناجائز ہے۔

نماز اور زکوٰۃ تمام دین کے لیے بمنزلۂ شیرازہ ہیں: نماز اور زکوٰۃ، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں تمام شریعت کے لیے بمنزلۂ شیرازہ ہیں۔ اگر ان کا ذکر ہو گیا تو گویا پوری شریعت کا ذکر ہو گیا۔

معروف پر عمل کی آزادی کا مفہوم: معروف و منکر پر بھی تفسیر سورۂ بقرہ میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ بعض سادہ لوح یہ سوال کرتے ہیں کہ جب قرآن نے معروف پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر گروہ اور ہر قوم کے لوگ اپنے اپنے معروف پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی کے جن شعبوں میں خود خدا اور رسولؐ نے معروف و منکر کو معین کر دیا ہے ان میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے معروف کو منکر یا اس کے منکر کو معروف بنائے۔ البتہ شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر قوم و ملک کے لوگ اپنے معروف پر عمل کے لیے آزاد ہیں۔

مسلمانوں کو بشارت: 'وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ' یہ مسلمانوں کو بشارت ہے کہ ابھی آغاز کار ہے اس وجہ سے حالات مشتبہ اور انجام پردے میں ہے۔ ممکن ہے تم کو بھی اور دوسروں کو بھی یہ تمکن کی بشارت مستبعد معلوم ہو رہی ہو لیکن انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر کے رہے گا۔

آگے کا مضمون ——— آیات ۴۲ - ۵۷

آیت ۴۱ پر توضیحی آیات، جو بیچ میں بطورِ جملہ معترضہ آگئی تھین، ختم ہوئیں، اب آگے کلام اپنے اصل سلسلہ سے پھر مربوط ہوگیا اور حضراتِ انبیائے کرامؑ اور ان کے مکذبین کی تاریخ کی روشنی میں نبی ﷺ آپؐ کے صحابہ کو تسلی دی گئی ہے کہ اطمینان رکھو ، اللہ کا ہر وعدہ پورا ہو کے رہے گااور اس کی ہر وعید شدنی ہے۔اگر اس کے ظہور میں کچھ تاخیر ہورہی ہے تو یہ سنتِ الٰہی کے تحت ہورہی ہے اس طرح اللہ اپنے نیک بندون کا امتحان اور ان کے مخالفین کو ڈھیل دے کر ان پر اپنی حجت تمام کرتا ہے۔لوگوں کے پاس آنکھیں ہو تو اس سنتِ الٰہی کے آثار اس ملک میں قدم قدم پر موجود ہین لیکن جن کے دلوں کی آنکھین اندھی ہوچکی ہیں ان پر یہ آثار کیا کارگر ہوسکتے ہیں!

اسی ذیل میں نبی ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ تم مخالفین کے رویے سے بے نیاز ہو کر ایک نذیر مبین کی طرح، لوگوں کو سامنے کے خطرے سے آگاہ کردو۔اگر تمہاری یہ دعوت کی راہ میں اڑنگے ڈالتے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہین ہے۔ہر نبی اور رسول کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے لیکن اللہ کی بات پوری ہوکے رہی اور مخالفین و شیاطین کی تمام فتنہ انگیزیاں اللہ نے نابود کردیں۔شیاطین کو ان فتنہ انگیزیوں کا اللہ نے جو موقع دیا ہے تو اس لیے دیا ہے کہ اس طرح حق پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور اہلِ علم و ایمان پوری بصیرت کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں، پھر ان کے قدم متزلزل نہیں ہوتے ----- اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ ﴿٤٢﴾ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ﴿٤٣﴾ وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ ۖ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ فَأَمْلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٤﴾

ترجمہ

اور اگر یہ لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے قوم نوحؑ، عاد، ثمود، (قوم ابراہیمؑ، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی تکذیب کر چکے ہیں)۔ اور مدین کے لوگ بھی تکذیب کر چکے ہیں۔ اور موسیٰؑ کی بھی تکذیب کی گئی تو میں نے ان کافروں کو کچھ ڈھیل دی، پھر ان کو دھر لیا تو دیکھو، کیسی ہوئی میری پھٹکار!

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت:

'وَكُذِّبَ مُوْسٰى' حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کا ذکر مجہول کے صیغہ سے کیا ہے درآنحالیکہ اوپر دوسرے انبیاؑء کی تکذیب کا ذکر ان کی قوموں کی طرف نسبت کے ساتھ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تکذیب ان کی قوم نے نہیں بلکہ فرعونیوں نے کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے صاحب شریعت نبی حضرت موسیٰؑ ہی تھے جن کے حالات کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے کسی تصریح کے بغیر، خاتمۂ کلام کے طور پر، بات یوں فرما دی گئی کہ تکذیب تو ابھی تم سے پہلے موسیٰؑ کی بھی ہو چکی ہے!

'نکیر' کا مفہوم: 'نکیر' اصل میں 'نکیری' ہے۔ 'ی' گر گئی ہے اور کسرہ اس کی یادگار ہے۔ عربی میں قافیہ وغیرہ کی رعایت سے 'ی' اس طرح گر جایا کرتی ہے۔ 'نکیر' کے معنی عام طور پر اہل لغت نے انکار کے لیے ہیں لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ کلام عرب کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی مجرد انکار کے نہیں بلکہ اس انکار کے ہیں جس کے ساتھ غیرت، نفرت اور بیزاری کی شدت پائی جاتی ہو۔ اس وجہ سے میں نے اس کا ترجمہ پھٹکار کیا ہے۔

رسولوں کے معاملہ میں قوموں کی مشترک روایت: ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری قوم تمہارے ساتھ جو معاملہ کر رہی ہے یہ ذرا بھی اس سے مختلف نہیں ہے جو دوسری قوموں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا۔ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ بعینہٖ یہی ہے جو ٹھیک ٹھیک تمہارے ساتھ بھی دہرائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت حال میں نہ تمہاری کسی کوتاہی کو دخل ہے اور نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں جن چیزوں سے مسلح ہو کر میدان میں اترنا تھا، ان میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔

تمہاری جانب سے سب کچھ ٹھیک ہے لیکن قوموں کی جو روایت ہے وہ بدلنے والی نہیں ہے۔ بس اپنا کام کیے جاؤ!لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑو۔

'فَاَمۡلَیۡتُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ' یعنی جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی ان کو اللہ نے فوراً نہیں پکڑا بلکہ ان کو کافی مدت تک ڈھیل دی لیکن اس ڈھیل نے اصلاح حال کے بجائے جب ان کی سرکشی ہی میں اضافہ کیا تو اللہ نے ان کو پکڑا اور پھر اس طرح پکڑا کہ ان کی ہستی یہ مٹادی۔ یہی معاملہ تمہاری قوم کے ساتھ بھی ہو گا اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی۔

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ﴿٤٥﴾

ترجمہ

اور کتنی ہی بستیاں ہیں، جن کو ان کے ظلم کی حالت میں ہم نے ہلاک کر دیا تو وہ اپنی چھتوں پر ڈھئی پڑی ہیں اور کتنے ناکارہ کنوئیں اور کتنے پختہ محل ہیں جو ویران پڑے ہوئے ہیں!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'قَصۡرٍ مَّشِیۡدٍ' کا مفہوم: 'قَصۡرٍ مَّشِیۡدٍ' پختہ اور بلند ایوان و محل کو کہتے ہیں۔ اور عربیت کے قاعدے کے مطابق، جس طرح 'بِئۡرٍ' کے ساتھ 'مُعَطَّلَةٍ' کی صفت ہے اسی طرح اس کے ساتھ بھی متروک و مہجور یا اس کے ہم معنی کوئی صفت ماننی پڑے گی جو، وضاحت قرینہ کی بنا پر، حذف کر دی گئی ہے۔

قوموں کے اخلاقی زوال کے نتائج: اوپر والی آیت میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے یہ اسی کی شہادت ملک عرب کے ان آثار سے پیش کی گئی ہے جن پر سے اہل عرب کے تجارتی قافلے برابر گزرتے تھے اور جن کی روایات، جیسا کہ ان کے شعراء اور خطبا کے کلام سے واضح ہے، ان کے ہاں مشہور تھیں۔ فرمایا کہ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ کتنے ہی شہر اور بستیاں ہیں، جن کو ان کے کفران نعمت کی پاداش میں، ہم نے ہلاک کر دیا اور اب ان کا حال یہ ہے کہ ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔

قوموں پر تباہی ان کے اخلاقی زوال کے نتیجہ میں آتی ہے: 'وَهِیَ ظَالِمَةٌ' یہاں حال کے محل میں ہے اور 'ظلم' کا مفہوم ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ اس سے مراد وہ ظلم ہے جو قومیں اپنے کفران نعمت اور اپنے شرک کے سبب سے خود اپنی جانوں پر ڈھاتی

ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ قوموں پر اس طرح کی جو تباہیاں آتی ہیں وہ محض اتفاقی حادثہ یا گردش روزگار کے طور پر نہیں آتی ہیں، جیسا کہ احمقوں نے سمجھا ہے، بلکہ ان کا ظہور ان کے اخلاق و کردار کے اندر سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی ناشکری میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کا یہ ظلم ان کے تمام انفرادی و اجتماعی اخلاق و کردار کی چولیں ہلا دیتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ پہلے ان کی عظمت کی چھتیں زمیں بوس ہوتی ہیں پھر ان کے وجود کی بنیادیں بھی اکھڑ جاتی ہیں۔

بربادی کی تصویر: 'فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا' صورت حال کی تصویر ہے۔ بڑی عمارتوں کے انہدام کا آغاز بالعموم ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ متروک و مہجور ہو جانے کے بعد پہلے ان کی چھتیں بوسیدہ ہو کر گرتی ہیں پھر دیواریں بھی غیر محفوظ ہو جانے کے باعث بادو باراں سے ڈھے جاتی ہیں۔

'وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ' کا عطف 'قَرْيَةٍ' پر ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ عرب کے ملک میں پانی کی قلت کے سبب سے کنوؤں اور چشموں کی بڑی اہمیت تھی۔ بستیاں وہیں بستی تھیں جہاں پانی دستیاب ہو اور کنوئیں بنائے جاسکتے ہوں۔ پھر لازماً سب سے زیادہ رونق بھی کنوؤں اور چشموں ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے کنوؤں کی ویرانی تعبیر ہے ساری ہماہمی اور تمام چہل پہل کے ختم ہو جانے کی۔

'وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ' کے ساتھ بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، کوئی صفت 'مُعَطَّلَةٍ' کی ہم معنی محذوف ماننی پڑے گی۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کتنے پر شکوہ اور بلند و بالا ایوان و محل ہیں جو بالکل متروک و مہجور پڑے ہیں اور جن کی ڈیوڑھیوں کے آگے کبھی بڑے بڑے سردار اور حکمران سجدے کرتے تھے۔ اب ان کے کنگروں اور ان کی برجیوں میں زاغ و زغن کے آشیانے ہیں!

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٤٦﴾

ترجمہ

کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سمجھتے یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سنتے کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر رہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

دل کے اندھے: یعنی یہ عبرت بخش آثار تو ہم نے زمین میں چھوڑے ہی اس لیے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں اور ان سے عبرت حاصل کریں تاکہ ان کے دلوں کے اندر سوچنے کی اور ان کے کانوں کے اندر سننے کی صلاحیت بیدار ہو اس لیے کہ اس دنیا کی اصل آفت یہ نہیں ہے کہ سروں پر جو آنکھیں لگی ہوئی ہیں وہ اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ سینوں میں جو دل ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اگر سروں کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہے اور سینے میں بسنے والا دل بیدار ہو تو آدمی نابینا ہو کر بھی تمام حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن دل کی آنکھیں چپاٹ ہو چکی ہوں تو وہ دیکھتا تو سب کچھ ہے لیکن اسے سوجھتا کچھ بھی نہیں!

یہاں 'قُلُوْبٌ' کے ساتھ 'فِی الصُّدُوْرِ' کی قید اس امر کا قرینہ ہے کہ 'الابصار' کے ساتھ 'فی الروؤس' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف مانا جائے۔ تقابل کا اصول، جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، اس کا تقاضا کر رہا ہے۔ چونکہ یہاں حال بے بصیرت لوگوں کا بیان ہو رہا ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ دل کا پتہ، اس کے مقام و محل کے تعین کے ساتھ دیا جائے کہ اصلی اندھا پن دل کا اندھا پن ہے اور یہ مکذبین رسول اسی اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ کوئی ان کے سر کی آنکھیں کھلی دیکھ کر ان کو بینا نہ سمجھے۔ اس لیے کہ آنکھوں کے اندر بصیرت کی روشنی دل کی راہ سے ہوتی ہے اور ان کے دل کی آنکھیں اندھی ہیں۔

آثار سے عبرت پذیری سے گریز: یہ امر خاص طور پر یہاں ملحوظ رہے کہ عرب کے شعراء منزل جاناں کے آثار پر تو خون کے آنسو بہاتے تھے یہاں تک کہ اس کے چولہے اور چکی کے آثار تک کو یاد کر کے روتے اور رلاتے لیکن ان کے اس سارے توسّم کی رسائی بس منزل جاناں کے آثار ہی تک تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے تاریخ کے ان آثار اور اپنے ملک کے ان کھنڈروں سے کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو دل کی آنکھیں کھولنے والی ہزاروں داستانیں زبان حال سے سنا رہے تھے۔ یہی حال ہمارے موجودہ زمانے کے ماہرین اثریات یا متوسمین کا ہے۔ انھوں نے بڑی گہری کھدائیاں کر کے بے شمار آثار سے عجائب خانے تو بھر دیے لیکن ان کی ساری تحقیق و تفتیش صرف اس نقطہ پر مرتکز ہے کہ یہ آثار پانچ ہزار برس پہلے کی تہذیب کے ہیں، یا سات ہزار برس پہلے کی تہذیب کے! وہ اصل حقیقت جس کی طرف یہ آثار اشارہ کر رہے ہیں نہ کسی کی سمجھ میں آئی ہے، نہ شاید آئے گی حالانکہ قدرت نے یہ آثار اسی حقیقت کی تذکیر کے لیے محفوظ کیے ہیں اس لیے کہ دلوں کے اندر بصیرت اسی حقیقت کے تذکر سے پیدا ہوتی ہے!

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٤٧﴾

ترجمہ

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی ہر گز خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے۔ اور تمہارے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

انسان کا ایک مغالطہ: یعنی تم کو جھٹلانے والے جلدی مچائے ہوئے ہیں کہ جس عذاب کی تم ان کو وعید سنا رہے ہو یہ آ کیوں نہیں جاتا؟ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ آئے گا تو ضرور، خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، لیکن انسان ہر چیز کو اپنے محدود پیمانوں سے ناپتا ہے اس وجہ سے اس کو چند سالوں کی مدت یا مہلت بہت طویل معلوم ہوتی ہے۔ وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے یہ سب ہوائی باتیں ہیں حالانکہ یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں لیکن خدا کے ہاں کے دن اس دنیا کے دنوں سے بالکل مختلف ہیں۔ خدا کے ہاں کا ایک دن اس دنیا کے دنوں کے حساب سے ایک ہزار سال کے مانند ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے سیکنڈ اور منٹ بھی اس دنیا کے برسوں کی مدت سے متجاوز ہوتے ہیں۔ انسان ہر چیز کا شمار اپنے چوبیس گھنٹوں کے دن کے حساب سے کرتا ہے اور خدا کے پروگرام اس کی اپنی تقویم کے اعتبار سے بنتے ہیں۔

خدائی دنوں کے پیمانے: مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ملکوت کے معاملات کو اپنے اوزان اور پیمانوں سے ناپنے اور تولنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے ہاں جب صدیاں گزر جاتی ہیں تو خدا کے ہاں وہ منٹوں اور گھنٹوں کی بات ہوتی ہے۔

خدائی دنوں کا یہ حساب جو یہاں مذکور ہوا ہے یہ بھی صرف تقریب فہم کے لیے ایک تمثیل ہے اور 'کَاَلْفِ سَنَةٍ' کے الفاظ خود اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اصل حقیقت ان دنوں کی کیا ہے؟ اس کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ یہ تمثیل جس طرح قرآن میں وارد ہوئی ہے اسی طرح زبور اور انجیل میں بھی ہے۔ 2: پطرس: باب 8-3 کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"یہ خاص بات تم پر پوشیدہ نہ رہے کہ خداوند کے نزدیک ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور ہزار برس ایک دن کے برابر۔"

آسمان و زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر جس طرح قرآن میں ہے اسی طرح تورات میں بھی ہے اور ان چھ دنوں میں تقسیم کار کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے اس کی تفصیل حٰمٓ السجدہ میں بیان ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے ہمارے اور آپ کے دن مراد نہیں ہیں بلکہ یہ خدائی ایام ہیں جن کے طول و عرض کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ہمارے لیے یہ اجمالی علم کافی ہے کہ خدا

نے الگ الگ عالم بنائے ہیں اور ہر عالم کا مدار و نظام الگ الگ ہے۔ ایک کے معاملات کو دوسرے پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے ہمیں اپنے گز سے آسمان وزمین کے طول و عرض کو ناپنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

قرآن سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ملکوت الٰہی کے نظام میں بعض امور کے لیے اس سے بھی بڑے دن مقرر ہیں۔ مثلاً جبریل امین اور ملائکہ کی دربار الٰہی میں خاص حضوری کے لیے جو دن ہے وہ پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ سورۂ معارج میں ہے:

تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ (معارج:4)

"فرشتے اور جبریل اس کی طرف ایک ایسے دن میں صعود کرتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔"

جن لوگوں نے آیت زیر بحث میں 'یوم' سے یوم قیامت مراد لیا ہے اور اس کے طول کو اس کی شدت عذاب سے استعارہ قرار دیا ہے ہمارے نزدیک ان کی تاویل سیاق کلام کے بھی خلاف ہے اور نظائر قرآن کے بھی۔ خاص طور پر اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد جیسے اکابر تفسیر کی طرف تو بالکل ہی خلاف حقیقت ہے۔ لیکن اس وضاحت کے بعد، جو ہم نے اوپر کی ہے، اب اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٨﴾

ترجمہ

اور کتنی ہی بستیاں ہیں، جن کو ان کے ظلم کے باوجود میں نے ڈھیل دی، پھر ان کو پکڑ لیا اور میری ہی طرف سب کی واپسی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب: یہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب ہے کہ خدا کی ڈھیل سے مغرور نہ ہو۔ کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جن کو ان کے کفران نعمت اور شرک کے باوجود ہم نے ڈھیل دی لیکن جب انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر ان کو دبوچ لیا اور پھر کوئی ان کو ہم سے چھڑانے والا نہ بن سکا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حشر تمہارا بھی ہونے والا ہے اگر تمہاری اس

اکڑ میں خم نہ پیدا ہوا۔ 'وَإِلَيَّ الْمَصِيْرُ' اور یہ بھی یاد رکھو کہ بالآخر سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہونی ہے۔ آخرت میں سب کو سابقہ صرف ہم سے پیش آئے گا۔ نہ کسی کے اعوان وانصار وہاں کسی کے کچھ کام آئیں گے نہ مزعومہ شرکاء وشفعاء۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٩﴾

ترجمہ

کہہ دو، اے لوگو! میں تو تمہارے لیے بس ایک کھلا ہوا آگاہی پہنچانے والا ہوں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

رسول کی اصل ذمہ داری: 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ عربوں میں یہ طریقہ تھا کہ قبیلہ یا قافلہ جہاں ڈیرا ڈالتا وہاں سے کسی اونچی جگہ پر ایک نگران پہرہ دیتا اور اگر وہ کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرتا تو اپنے کپڑے اتار کر ننگا ہو جاتا اور خطرے کا اعلان کرتا جس کے بعد قبیلہ یا قافلہ کے سارے مرد تلواریں سونت کر مدافعت کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ یہ تعبیر چونکہ ناشائستہ تھی، نبی کے لیے اس کا استعمال موزوں نہ تھا، اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' کی شکل میں شائستہ بنالیا ہے لیکن اس میں تلمیح 'نذیر عریاں' ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح ایک 'نذیر عریاں' قوم کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے تم ایک 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' بن کر لوگوں کو آنے والے وقت سے آگاہ کر دو۔ لیکن بس آگاہ کر دو۔ نہ اس خطرے کو دکھا دینا تمہاری ذمہ داری ہے نہ اس سے لوگوں کو بچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر لوگ تمہارے اس واضح انذار کے بعد بھی متنبہ نہ ہوں گے تو نتائج کی ذمہ داری خود ان پر ہے۔ یہ مضمون 'إِنَّمَا' کے اندر جو حصر کا مفہوم ہے اس سے نکلتا ہے۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٥٠﴾ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٥١﴾

ترجمہ

تو جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ اور جن کی تگ و دو ہماری آیات کی مخالفت کی راہ میں ہے وہی دوزخ والے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یہ وہ اصل انذار ہے جس سے آشکارا طور پر لوگوں کو آگاہ کر دینے کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی۔ اس کا آغاز اگرچہ اہل ایمان کے لیے بشارت سے ہوا ہے لیکن یہاں یہ بشارت بھی انذار ہی کا مقدمہ ہے اس لیے کہ کلام کا رخ قریش کے مستکبرین کی طرف ہے اور یہ بشارت ان کے غرور پر ایک کاری ضرب ہے۔ فرمایا کہ لوگوں کو سنا دو کہ وہ وقت آ رہا ہے جب ایمان و عمل صالح والوں کو تو مغفرت اور رزق کریم کی سرفرازی حاصل ہو گی، رہے وہ لوگ جن کی ساری بھاگ دوڑ ہماری آیات کی تکذیب اور ہمارے رسول کو شکست دینے کی راہ میں ہے وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

’رِزْقٌ كَرِيْمٌ‘ مغفرت کا ثمرہ اور جنت کی تمام نعمتوں کی ایک جامع تعبیر ہے۔ یہاں ’كَرِيْمٌ‘ کی صفت اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتی ہے جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

’مُعَاجَزَة‘ کے معنی اس مسابقت کے ہیں جو کسی کو شکست دینے کے لیے کی جائے۔ یہاں اس سے اشارہ کفار کی اس بھاگ دوڑ کی طرف ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینے کے لیے وہ کر رہے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٢﴾

ترجمہ

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا تو شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے ڈالے۔ پس اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو، پھر اللہ اپنی باتوں کو قرار بخشتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'تمنّٰی' کا لغوی مفہوم: 'تمنّٰی' کا اصل لغوی مفہوم، صاحب اقرب الموارد کی تصریح کے مطابق یہ ہے:

تطلق عند اهل العربية على طلب حصول الشئ على سبيل المحبة و على الكلام الدال على هذا الطلب

(عربی زبان کے ماہرین کے نزدیک یہ لفظ کسی شے کے بطریق محبت حصول کی طلب کے لیے بولا جاتا ہے اور اسی طرح اس کلام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو اس طلب پر دال ہو)

میں نے اس قول کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ میرے نزدیک کلام عرب کی روشنی میں، اس لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے سات آٹھ مقامات میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اسی مادے سے 'امنية' کا لفظ بھی جمع اور واحد کی مختلف صورتوں میں، سات آٹھ جگہ آیا ہے۔ ہر جگہ، ہر شکل میں، حوصلہ کرنا، یا کسی مقصد کے لیے اپیل یا اتمالت کرنا۔ اسی طرح 'امنية' کے معنی خواہش، ارمان، تمنا، حوصلہ اور اپیل کے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس لفظ کے اندر بعض لوگوں نے قراءت کرنے کے معنی کہاں سے گھسا دیے ہیں۔ مجھے اس معنی میں یہ لفظ، کلام عرب میں کہیں نہیں ملا حالانکہ یہ عربی زبان کے کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے۔ بعض مفسرین نے اس مفہوم کی تائید میں ایک شعر نقل کیا ہے لیکن اول تو ایک کثیر الاستعمال لفظ کو، اس کے معروف مفہوم سے ہٹانے کے لیے، ایک غیر معروف شعر کی سند کی وقعت کیا ہے۔ پھر وہ شعر بھی ہمارے نزدیک منحول ہے اور ہم اس کا منحول ہونا ثابت کر سکتے ہیں لیکن ایک غیر مفید بحث کو طول دینے سے کیا حاصل؟ اس بات کی بھی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے کہ صاحب لسان نے لفظ کے اس مفہوم کا بھی حوالہ دیا ہے۔ صاحب لسان کی ساری خوبیوں کے اعتراف کے باوجود، ان کی اس خامی کی طرف مقدمۂ تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بسا اوقات وہ کسی لفظ کے تحت اہل تاویل کے بے سند اقوال بھی نقل کر دیتے ہیں اور چونکہ اس لغت کا بڑا پایہ ہے اس سے جو لوگ لغت کے نقادوں میں سے نہیں ہیں وہ اس طرح کے اقوال کو لے اڑتے ہیں حالانکہ اس اقوال کی، جب تک زبان کے استعمالات سے تائید نہ ہو، کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بہر حال ہمارے نزدیک اس لفظ کے اندر قراءت یا تلاوت کے معنی کے لیے کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔

اب آیت کے مفہوم اور اس کے اجزاء پر غور کیجیے۔

آیت ۵۲ کا صحیح مفہوم: اوپر والی آیت میں معاندین کی جس سعی فی المعاجزۃ کا ذکر ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمہی کو پیش آئی ہو۔ تم سے پہلے جتنے رسول اور نبی بھی آئے سب کو اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا۔ جب بھی کسی نبی نے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے کوئی قدم اٹھایا، کوئی حوصلہ کیا، کوئی

دعوت دی اور خلق کو سکھانے، سدھارنے، بلانے اور پرچانے کی کوشش کی تو اشرار و مفسدین نے اسی طرح اس کے حوصلے کی راہ میں اڑنگے ڈالے اور اس کی آواز کو دبانے اور اس کی تعلیم و دعوت کو شکست دینے کی کوشش کی۔ یہ امر ملحوظ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی دعوت واصلاح کے ارادے سے اٹھتے تو ابولہب وابوجہل وغیرہ آپؐ کی تردید کے لیے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ پھرتے۔

یہاں ہدایت و اصلاح کی راہ میں نبی کے اقدام کو تمنّی اور اس کی سعی و جہد کو 'امنیۃ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'امنیۃ' کے معنی آرزو، حوصلہ اور ارمان کے ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کی تمنا اور آرزو تو شب و روز یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کی ہدایت اور اس کی باتیں (آیات) اتارنے کی کوئی راہ کھلے اور وہ یہ راہ کھولنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتا رہتا ہے لیکن شیاطین ہر وقت یہ راہ مارنے کے لیے گھات میں رہتے ہیں اور جہاں ان کو نبی کی کوئی بات بنتی نظر آئی فوراً اس کے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈے شروع کر دیتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھیے کہ شیاطین اس وقت تو میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں جب تک وہ دیکھتے ہیں کہ کسی طرف سے کلمۂ حق کی صدا نہیں آرہی ہے لیکن جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی دعوت حق بلند ہوئی تو ان کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگتا ہے اور پھر وہ اس کی مخالفت کے لیے اپنے تمام حربوں سے مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

نبی اور رسول کے فرق پر ہم آل عمران ۴۹ کے تحت وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں ان دونوں لفظوں کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس آزمائش سے کوئی نبی یا رسول بھی نہیں بچا ہے۔ یہ آزمائش انبیاء ورسل کے لیے اللہ کی ایک سنت ہے جو سب کو پیش آچکی ہے۔

لفظ 'شیطان' یہاں بطور اسم جنس ہے اور اس سے مراد شیاطین جن وانس دونوں ہیں۔ یعنی دونوں گٹھ جوڑ کر کے نبی کو شکست دینے کے لیے ایک متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔

شیاطین کی فتنہ انگیزیاں: 'اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ' سے مراد یہ ہے کہ وہ نبی کے کام و اقدام اور اس کے ارادوں اور منصوبوں میں طرح طرح سے رخنہ اندازیاں کرتے اور قسم قسم کے اعتراضوں، طعنوں، شگوفہ بازیوں سے اس کے کلام و پیغام کے اثر کو مٹانے کے درپے ہوتے ہیں۔

'فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ'۔ 'نسخ' کے معنی، جیسا کہ آیت نسخ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، مٹانے کے ہیں اور 'اِحکام' کے معنی پابرجا اور مستحکم کرنے کے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء ورسل کو یہ آزمائش اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت پیش آتی ہے

اور اس کا فائدہ، جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے، دعوت حق کو پہنچتا ہے۔ حق و باطل کے اس تصادم کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ اللہ شیاطین کے اٹھائے ہوئے فتنوں کو تو جھاگ کی طرح بٹھا دیتا ہے اور اپنی اور اپنے رسول کی باتوں کو دلوں میں رسوک و استحکام بخشتا ہے۔

'وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ'۔ یہ تسلی کے مضمون کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے حوالہ سے مزید مؤکد و مدلل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل میں یہ کشمکش کراتا ہے اور اپنے نبیوں کی دعوت کے مقابلہ میں شیاطین کو بھی زور آزمائی و فتنہ انگیزی کا موقع جو دیتا ہے تو یہ سب کچھ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے نبی کو اللہ کے علم اور اس کی حکمت پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر مبنی ہو گا اور اس کا نتیجہ اس کی دعوت کے حق میں بہتر ہی نکلے گا۔

بعینہٖ یہی مضمون بتغیر الفاظ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ بعض نظائر ملاحظہ ہوں سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ یُوۡحِیۡ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ط وَلَوۡ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوۡہُ فَذَرۡہُمۡ وَمَا یَفۡتَرُوۡنَ ۝ وَلِتَصۡغٰۤی اِلَیۡہِ اَفۡـِٕدَۃُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ وَلِیَرۡضَوۡہُ وَلِیَقۡتَرِفُوۡا مَا ہُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ (الانعام:۱۱۳-۱۱۴)

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں خلق کی فریب دہی کے لیے القا کرتے ہیں اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے تو ان کو اور ان کی اس ساری فریب کاری کو نظر انداز کرو۔ اللہ نے اس کا موقع اس لیے دے رکھا ہے کہ اس سے اہل ایمان کا ایمان محکم ہو اور تاکہ اس فتنہ کی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی یہ کرنی چاہتے ہیں کر لیں۔

ان آیات سے سورۂ حج کی زیر بحث آیت کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر 'یُوۡحِیۡ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا' کے الفاظ نگاہ میں رہیں۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو آیت زیر بحث میں 'اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِہٖ' کے الفاظ سے تعبیر فرمائی گئی ہے۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ہے:

وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ط وَکَفٰی بِرَبِّکَ ہَادِیًا وَّنَصِیۡرًا ۝ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَۃً وَّاحِدَۃً ج کَذٰلِکَ ج لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلۡنٰہُ تَرۡتِیۡلًا ۝ وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَاَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا (فرقان:۳۱-۳۳)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن بنائے اور اطمینان رکھو، تمھارا رب رہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے۔ اور یہ کافر اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اس شخص پر یہ قرآن آخر یک دفعہ کیوں نہیں نازل کر دیا گیا! ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ اس بار گراں کے

لیے تمھارے دل کو اس کے ذریعہ سے اچھی طرح مضبوط کر دیں اور ہم نے اس کو اہتمام کے ساتھ بالتدریج اتارا۔ اور یہ جو شگوفہ بھی چھوڑیں گے تو ہم اس کے جواب میں حق کو واضح اور اس کی بہترین توجیہ کریں گے۔

اس آیت میں اس القائے شیطانی کی ایک مثال بھی پیش کر دی گئی ہے کہ اللہ کا رسول جب لوگوں کے سامنے اللہ کا کلام پیش کرتا ہے تو یہ معاندین، رسول کو مطعون کرنے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑتے ہیں کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو یہ پورا قرآن بیک دفعہ کیوں نہیں پیش کر دیتے! آخر اللہ کے لیے یہ کیا مشکل ہے! مطلب یہ ہے کہ جب یہ ایسا نہیں کر رہے ہیں تو اس کے معنی (نعوذ باللہ) یہ ہیں کہ یہ خود اس کلام کو گھڑتے ہیں اور جتنا گھڑ پاتے ہیں اتنا سنا دیتے اور دھونس جمانے کے لیے جھوٹ موٹ اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

القائے شیطان کی بے بنیاد روایت: اس آیت کی توضیح میں ہم نے س قدر تفصیل سے صرف اس لیے کام لیا ہے کہ کسی کے ذہن میں کوئی خلجان باقی نہ رہ جائے۔ اس توضیح کے بعد اس فضول سی روایت کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی ہمارے مفسرین نے، اللہ ان کو معاف کرے، اپنی کتابوں میں اس آیت کے شان نزول کی حیثیت سے درج کر دی ہے۔ اول تو یہ آیت، جیسا کہ آپ نے دیکھا، کسی شان نزول کی محتاج نہیں ہے بلکہ اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح اور اپنے سابق ولاحق سے بالکل مربوط ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ جو روایت یہ حضرات نقل کرتے ہیں نہ اس کا روایت کے اعتبار سے کوئی وزن ہے نہ درایت کے پہلو سے بلکہ وہ محض زنادقہ کا ایک القائے شیطانی ہے جو انھوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو مجروح کرنے کے لیے گھڑا اور حضرات مفسرین اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے آرہے ہیں۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾

ترجمہ

یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو ان لوگوں کے لیے فتنہ بنائے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو سخت دل ہیں اور بے شک یہ ظالم اپنی مخاصمت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی پہلی حکمت: اب یہ حکمت واضح فرمائی جا رہی ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں یہ صورت حال کیوں ہے کہ جب کوئی دعوت حق و خیر اٹھتی ہے تو اس کے مقابل میں اشرار و شیاطین بھی اپنی تمام فتنہ انگیزیوں کے ساتھ میدان میں اترتے ہیں؟ فرمایا کہ یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے حق کے ساتھ باطل کو بھی اس دنیا میں مہلت دے رکھی ہے تاکہ جو حق کو اختیار کرے وہ بھی اختیار و تمیز کے ساتھ کرے اور جو باطل کی طرف جانا چاہے وہ بھی وضوح حق اور اتمام حجت کے بعد جائے۔ اسی کشمکش سے اہل ایمان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اسی سے منافقین اور سخت دلوں پر اللہ کی حجت تمام ہوتی ہے۔

اشرار کے فتنوں کے مخفی فوائد: 'فتنۃ' سے مراد آزمائش اور امتحان ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حق کے مقابل میں باطل اور اہل باطل کو بھی زور آزمائی کا موقع نہ دیا گیا ہوتا تو حق پرستوں اور باطل پرستوں میں امتیاز نہ ہوتا۔ یہ مقع مل جانے سے اہل باطل، اپنا من بھاتا کھاجا پاکر، باطل کے علمبرداروں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور جو سچے حق پرست ہوتے ہیں، اہل باطل کی تمام باطل آرائیوں کے علی الرغم، حق پر جمے رہتے ہیں۔

'لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ'۔ مرض سے مراد نفاق ہے اور 'قاسیۃ القلوب' سے اشارہ قریش اور یہود کے ان کٹر معاندین کی طرف ہے جن کے باہمی گٹھ جوڑ سے، دعوت حق کے خلاف یہ مہم چل رہی تھی۔ فرمایا کہ باطل کو یہ مہلت اللہ نے اس لیے دی ہے کہ یہ منافقین اور اشرار کے لیے ایک فتنہ بنے۔ وہ حق کے خلاف جو کھیل کھیلنے چاہتے ہیں وہ کھیل لیں اور اپنے دل کے ارمان پورے کر لیں۔

حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی دوسری حکمت: 'وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ'۔ یہ انہی بدبختوں اور شامت زدوں کی حالت پر اظہار افسوس ہے کہ اب یہ حق کی مخالفت میں اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ان کی بازگشت کا کوئی امکان نہیں۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں!

وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

ترجمہ

اور ایسا اس لیے بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو علم عطا ہوا ہے اچھی طرح جان لیں کہ یہی تیرے رب کی جانب سے حق ہے پس ان کے ایمان اس پر پختہ ہوں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں اور اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ضرور صراط مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ'۔ 'وَلِيَعْلَمَ' اور 'فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ' دونوں مقامات میں فعل اپنے کامل معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور 'اُوْتُوا الْعِلْمَ' میں 'علم' سے مراد قرآن و کتاب کا علم ہے۔ یہ حق کے مقابل میں باطل کو مہلت دیے جانے کی دوسری حکمت بیان ہوئی ہے کہ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح وہ لوگ، جو علم کتاب سے کچھ بہرہ ور ہو چکے ہیں، اپنے علم میں پوری طرح راسخ ہو جاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ جو علم کتاب تم سے ان کو ملا ہے وہ بالکل حق اور منجانب اللہ ہے۔ پھر ان کے علم کی یہ پختگی ان کے ایمان کو بھی پورا رسوخ و استحکام بخشتی ہے اور ان کے دل پوری یکسوئی اور کامل رضا کے ساتھ اپنے رب کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

اشیا کی اصل حقیقت ان کے اضداد سے واضح ہوتی ہے: یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ اشیا کی اصل حقیقت ان کے اضداد ہی سے واضح ہوتی ہے۔ ایک بات کو آپ جانتے اور مانتے ہیں لیکن اس کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اگر آپ کے سامنے نہیں آیا تو اس بات کا بڑا امکان ہے کہ وہ جب سامنے آئے تو آپ کا علم و ایمان متزلزل ہو جائے۔ لیکن وہ سب کچھ اگر آپ کے سامنے آچکا ہے اور اس کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کر کے آپ نے اس حق کو قبول کیا ہے تو اس کو علی وجہ البصیرت آپ نے اختیار کیا ہے۔ پھر اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی باد مخالف آپ کے موقف سے آپ کو ہٹا سکے۔ دین میں یہی بصیرت پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں یہ انتظام فرمایا کہ حق کے مخالفین کو بھی یہ موقع دیا ہے کہ وہ حق کے خلاف جو زہر اگلنا چاہتے ہیں وہ اگل لیں تاکہ جو لوگ حق کو قبول کریں محض تقلیدی طور پر نہ اختیار کریں بلکہ پوری معرفت کے ساتھ اختیار کریں۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا علم راسخ، اور مبنی بر حکمت و بصیرت ہو گا ان کا ایمان بھی تقلیدی نہیں ہو گا جو ہر جھونکے سے متزلزل ہو جائے بلکہ صحیح اور راسخ علم سے صحیح اور راسخ ایمان پیدا ہوتا ہے اور اسی راسخ ایما سے وہ اسلام و اِخبات وجود میں آتا ہے جو ایمان کی اصل روح ہے اور جس کے بغیر ایمان خدا کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

اہل ایمان کو ثبات قدم کی بشارت: 'وَاِنَّ اللّٰہَ لَھَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ'۔ جس طرح اوپر منافقین اور اشرار سے متعلق فرمایا ہے کہ 'وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ'۔ (اب یہ لوگ اتنی دور نکل جا چکے ہیں کہ ان کی حق کی طرف بازگشت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا) اسی طرح اس ٹکڑے میں اہل ایمان سے متعلق بشارت دی ہے کہ اگرچہ شیاطین ان کی راہ مارنے کی تو بہت کوشش کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو ضائع نہیں ہونے دے گا بلکہ اپنی توفیق بخشی سے ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف فرمائے گا۔ 'صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ' سے مراد وہ سیدھی راہ ہے جو بندے کو اس کے رب کی طرف لے جاتی ہے۔ نکرہ یہاں میرے نزدیک اس کی اہمیت و شان کے اظہار کے لیے ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ ﴿٥٥﴾

ترجمہ

اور یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے برابر اس کی طرف سے شک ہی میں رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آدھمکے یا ایک منحوس دن کا عذاب آجائے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مخالفین کو وعید: اوپر اہل علم و ایمان کی تعریف میں فرمایا کہ مخالفین کی مخالفتیں ان کے اندر اس بات کو راسخ کرتی ہیں کہ پیغمبر جو وعد و وعید سنا رہے ہیں وہ بالکل حق ہے اب فرمایا کہ رہے یہ مکذبین تو وہ اس وعد و وعید کی طرف سے اسی طرح شک میں مبتلا رہیں گے جس طرح آج ہیں۔ یہ تو اسی وقت مانیں گے جب ان پر یا تو قیامت اچانک آدھمکے یا کسی ہولناک منحوس دن کا عذاب ان پر آجائے۔ 'عقیم' بانجھ کو کہتے ہیں:

'قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ' (ذاریات:29)

(وہ بولی کہ میں تو ایک بانجھ ہوں)

یہیں سے اس کے اندر بے فیض اور منحوس کا مفہوم پیدا ہوا اور اس کا اطلاق اس طوفانی ہوا پر بھی ہوا جو تباہی تو قیامت کی مچادے لیکن اس کے اندر نفع کا کوئی پہلو نہ ہو۔ چنانچہ قوم عاد پر جو عذاب آیا اس کے لیے قرآن نے 'رِیْحٌ عَقِیْمٌ' کا لفظ استعمال کیا ہے:

’وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ‘ (ذاریات:41)

(اور ان کے لیے قوم عاد کے اندر بھی درس عبرت ہے جب کہ ہم نے ان پر منحوس ہوا بھیجی)

سورۂ قمر آیت 19 میں ’یَوْمِ نَحْسٍ‘ کی ترکیب بھی استعمال ہوئی ہے۔ ان کی تفصیلات ان کے محل میں دیکھیے۔

الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٥٦﴾

ترجمہ

اس دن سارا اختیار اللہ ہی کو حاصل ہو گا۔ وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ہوں گے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

’اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ‘ فرمایا کہ اگر یہ لوگ ظہور قیامت ہی کے منتظر ہیں تو اس بات کو یاد رکھیں کہ اس دن سارا اختیار و اقتدار صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کا ہو گا۔ اس دن نہ ان کی جمعیتیں اور پارٹیاں ان کے کچھ کام آئیں گی اور نہ ان کے مفروضہ شرکاء و شفعاء اور وہ دن جزا و سزا کے فیصلہ اور عدل کے ظہور کا ہو گا نہ کہ سعی و عمل کا۔ اس دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرما دے گا کہ کون جیتا اور کون ہارا اور ہر ایک اپنے عمل کے نتائج سے دوچار ہو گا۔

یہ اس فیصلہ کا اعلان ہے جس کا اوپر والے ٹکڑے میں ذکر ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس دن جو ایمان و عمل صالح والے لوگ ہیں وہ نعمت کے باغوں میں داخل ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥٧﴾

ترجمہ

اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی وہی ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری باتوں کی تکذیب کی ہے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہو گا۔ ذلیل کرنے والا عذاب اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو خدا اور رسول کے پیش کردہ حق سے بھی بالاتر سمجھا جو بدترین استکبار ہے۔ اس استکبار کی بنا پر وہ مستحق ہیں کہ آخرت میں ان کو صرف عذاب ہی نہ دیا جائے بلکہ وہ عذاب دیا جو ذلیل کرنے والا بھی ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اسی سزا کی سنگینی دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے جو تعذیب کے ساتھ ساتھ اپنے اندر توہین و تذلیل کی پھٹکار بھی رکھتی ہو۔

آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۸ - ۷۶

آگے ان مسلمانوں کی پہلے دلداری فرمائی ہے جو اس پر محن دور میں، اعدائے حق کی ستم رانیوں سے تنگ آکر اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے، مختلف علاقوں کو ہجرت کر رہے ہیں۔ ان کو اپنی صفات کا حوالہ دے کر اطمینان دلایا ہے کہ سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔ جس طرح مایوسی کے بعد رحمت کی گھٹائیں اٹھتی ہیں اور زمین کو جل تھل کر دیتی ہیں اسی طرح تمہارے لیے بھی رحمت کی گھٹائیں برسیں گی اور تم نہال ہو جاؤ گے۔ تمہارے اعداء کو خدا جو مہلت دے رہا ہے تو اس لیے دے رہا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، وہ عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا لیکن اس مہلت کی ایک حد ہے۔ اگر انہوں نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا انجام دیکھیں گے۔

اس کے بعد نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تمہارے یہ مخالفین جس ڈگر پر چلتے آئے ہیں، اسی پر چلتے رہیں گے تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو اور ان کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ جلد وہ دن جب خدا ان کے معاملے کا فیصلہ کرے گا۔ اس دن ان کے یہ معبود کچھ کام آنے والے نہیں جن کے خلاف کچھ سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ ان کے تن بدن میں آگ لگتی ہے تو لگے۔ تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ تمہارے یہ معبود سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس سے اس چیز کو واپس لینے پر قادر نہیں ہیں۔ ان احمقوں کو یہ بھی سمجھا دو کہ فرشتوں کی حیثیت خدا کی بیٹیوں یا اس کے شریکوں کی نہیں بلکہ اس کے بندوں کی ہے۔ وہ ان کے اندر سے بھی اسی

طرح اپنے پیغامبر منتخب کرتا ہے جس طرح انسانوں میں سے کرتا ہے۔ وہ ہر وقت خدا کے احاطہ میں ہیں۔ معاملات کا مرجع اور ان کا فیصلہ کرنے والا صرف اللہ ہی ہے ــــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجئے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ ان کو اپنے رزق حسن سے نوازے گا۔ اور بے شک اللہ ہی ہے جو بہترین رزق دینے والا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

راہ ہجرت میں اول قدم بھی منزل کے حکم میں ہے: اب یہ اسی اوپر والی بشارت پر، جو اہل ایمان کو دی گئی ہے، عطف کر کے خاص طور پر ان مظلوم مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے جو کفار قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آکر، اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں گے وہ اطمینان رکھیں کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے دارالہجرت میں پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیے گئے یا ان کو موت آگئی تو ان کو شہادت کا درجہ نصیب ہو گا اور اللہ ان کو اپنے رزق حسن سے نوازے گا۔ آل عمران آیت 169 میں یہ بات گزر چکی ہے کہ خدا کی راہ میں مارے جانے والے مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں اور وہ اپنی برزخی زندگی میں بھی خاص اپنے رب کے خوان نعمت سے رزق پاتے ہیں۔ 'بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ'

راہ ہجرت میں طبعی موت بھی شہادت کا درجہ رکھتی ہے: یہی بشارت یہاں ان لوگوں کو بھی دی گئی جو ہجرت کے ارادے سے نکلیں اور ان کو موت آجائے اگرچہ ان کو قتل نہ کیا گیا ہو۔ گویا اس راہ میں قتل ہونا ہی شہادت نہیں ہے بلکہ طبعی موت بھی شہادت ہی کے حکم میں ہے۔ 'رزق' یہاں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں، خدا کے بے پایاں انعامات کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اس کو محدود مفہوم میں نہیں لینا چاہیے۔ 'وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا جب 'خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ' ہے تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو کیا رزق دے گا جو اس کی خاطر اپنا گھر در سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے!

لَيُدْخِلَنَّهُم مُّدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿٥٩﴾

ترجمہ

وہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جس سے وہ راضی و مطمئن ہوں گے اور بے شک اللہ علیم و حلیم ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مہاجرین کے لیے عظیم بشارت: فرمایا کہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں پہنچ کر وہ نہال ہو جائیں گے۔ 'یَرْضَوْنَہ' کا لفظ ہے تو نہایت مختصر سا لیکن اس کے اندر معانی کا ایک جہاں پوشیدہ ہے۔ یعنی خدا کی خاطر جو بندہ اپنے گھر اور وطن سے نکلتا ہے، اگر اسی راہ میں اس کو موت آجاتی ہے تو وہ اطمینان رکھے کہ خدا اس کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں اس کی ساری توقعات ہی پوری نہیں ہو جائیں گی بلکہ وہ کچھ اس کو ملے گا جس کا اس جہان میں وہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں: 'وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ' یعنی ہمارے بندے پورا اطمینان رکھیں کہ اس دنیا میں ہماری خاطر اعدائے حق کے ہاتھوں وہ جو کچھ جھیل رہے ہیں ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم ہر چیز سے واقف ہیں۔ لیکن 'علیم' کے ساتھ ساتھ ہماری صفت 'حلیم' بھی ہے۔ اس وجہ سے ہم انے دشمنوں کو جلدی نہیں پکڑتے بلکہ ان کو اصلاح حال کا پورا موقع دیتے ہیں۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ ہمارے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔

ذَٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنصُرَنَّهُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴿٦٠﴾

ترجمہ

یہ بات سن لی اور مزید یہ کہ جس نے ویسا ہی بدلہ دیا جیسا کہ اس کے ساتھ کیا گیا، پھر اس پر تعدی کی گئی تو اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

ایک اہم اعلان: یہ 'ذٰلِکَ' جس طرح آیت 30 میں گزر چکا ہے پورے جملہ کا قائم مقام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات جو کہی گئی ہے کوئی سر سری بات نہیں ہے بلکہ نہایت اہم حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اس کو دوست اور دشمن اچھی طرح سن لیں۔ مزید برآں اب یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ مظلوم مسلمان اگر اپنے جان و مال کی مدافعت میں برابر سرابر کا کوئی اقدام کریں تو ان کو اس کا حق ہے۔ ان کو اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ اور اگر اس کے بعد ان پر کوئی مزید تعدی کی گئی تو ان کے اعداء یاد رکھیں کہ خدا اپنے بندوں کی پشت پر ہے اور وہ ان کی ضرور مدد فرمائے گا۔

'وَمَنۡ عَاقَبَ بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبَ بِهٖ' میں 'عُوۡقِبَ بِهٖ' مماثلت کے اسی اسلوب پر ہے جو 'دِنَّاهم كما دانوا' یا 'جزاء سيئة سيئة مثلها' وغیرہ میں ملحوظ ہے۔ 'ثُمَّ بُغِيَ عَلَيۡهِ' میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اگر مسلمانوں کے کسی مدافعانہ اقدام سے چڑ کر کفار نے ان پر مزید تعدی کی کہ ان کا حوصلہ پست کر دیں کہ وہ آئندہ اپنے عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے کوئی جرأت نہ کر سکیں تو کفار یاد رکھیں اور مسلمان مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہرگز ایسا نہیں ہونے دے گا بلکہ وہ اپنے بندوں کی ضرور مدد فرمائے گا۔ 'ضرور مدد فرمائے گا' کے اجمال کے اندر جو تفصیل پوشیدہ ہے، اس کی شہادت بعد کے واقعات نے دی اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بشارت مسلمانوں کو ہجرت کے وقت دی گئی تھی۔ بعد میں جب مسلمان مدینہ پہنچ کر ایک طاقت بن گئے تو یہی بات نہایت واضح الفاظ میں کہہ دی گئی جو آیات 40-39 میں گزر چکی ہے۔ ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'عَفُوٌّ غَفُوۡرٌ' کی صفات کے حوالہ کا ایک خاص محل: 'اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ' کا یہاں ایک خاص محل ہے۔ یہ بات، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بالکل ہجرت کے وقت فرمائی گئی تھی۔ اس وجہ سے امکان تھا کہ کفار کے ہاتھوں ستائے ہوئے مسلمان جو اپنی کارروائی کے طور پر کوئی عاجلانہ قدم اٹھاویں درآنحالیکہ ابھی اس کے لیے موزوں وقت نہیں آیا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات 'عفو' و 'غفور' کی یاددہانی فرمادی کہ ہرچند تمہیں اپنی جان، اپنے مال اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کا حق ہے اور خدا تمہاری پشت پر ہے لیکن ہم جس طرح لوگوں کی تعدی کے باوجود عفو و مغفرت سے کام لیتے ہیں اسی طرح چندے تم بھی عفو و درگزر سے کام لو۔ ان سرکشوں سے نمٹنے کا وقت بس آہی رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا رب اپنی صفات کا عکس تمہارے اندر بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ اللَّيۡلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيۡلِ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌۢ بَصِيرٌ ﴿٦١﴾

ترجمہ

یہ اس وجہ سے ہو گا کہ اللہ ہی ہے جو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

وعدۂ نصرت کی پہلی دلیل: یہ اوپر کے وعدۂ نصرت کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ خدا اس کائنات میں کوئی ناکارہ وجود نہیں ہے، جیسا کہ ان احمقوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ مصرف حقیقی وہی ہے۔وہی ہر روز دن کے بعد رات کو لاتا ہے اور رات کے بعد دن کو نمایاں کرتا ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے یعنی (نعوذ باللہ) وہ کوئی اندھا بہرا نہیں ہے کہ اشرار و مفسدین اس کی دنیا میں جو دھاندلی مچاتے پھریں وہ بے خبر بیٹھا رہے۔وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔تو جب مصرف حقیقی بھی وہی ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا بھی ہے تو آخر وہ اس کائنات کی سیاست سے بے تعلق کیسے رہے گا؟ لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابل میں، جو اس کی دنیا میں فساد برپا کر رہے ہیں، ان لوگوں کی مدد فرمائے جو اس کی اصلاح کے طالب ہیں اور جب وہ رات کے بعد دن کے لانے پر قادر ہے اور اس کی اس قدرت کا مشاہدہ ہر شخص ہر روز کر رہا ہے تو کفر کی تاریکی کو مٹاکر دنیا کو ایمان کی روشنی سے جگمگا دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے!

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿٦٢﴾

ترجمہ

یہ اس وجہ سے بھی ہو گا کہ اللہ ہی معبود حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں سب باطل ہیں۔اور بے شک اللہ ہی ہے جو برتر اور عظیم ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

وعدۂ نصرت کی دوسری دلیل: یہ اسی بات کی دوسری دلیل ارشاد ہوئی کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ آخر ان مخالفین کی پشت پر بھی تو کچھ طاقتیں ہیں۔فرمایا کہ اس کائنات میں کارفرمائے حقیقی صرف اللہ ہے اور یہ لوگ اللہ کے

سوا جن چیزوں کو پوجتے اور پکارتے ہیں سب بے حقیقت، محض وہم کی ایجاد، اور یکسر فریب اور دھوکا ہیں۔اللہ بڑی ہی بلند و برتر اور عظیم ہستی ہے۔ان پتھر اور مٹی کی مورتوں کا خدا کے ساتھ کیا جوڑ؟ جو احمق ان چیزوں کو معبود بنا کر پوج رہے ہیں وہ خدا کی عظمت و شان سے بالکل بے خبر ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً ۗ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿٦٣﴾

ترجمہ:

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں سے پانی برساتا ہے تو زمین اس سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔بے شک اللہ بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

وعدۂ نصرت کی تائید میں آفاق کی شہادت: 'اَلَمۡ تَرَ' کے خطاب پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو توجہ دلانے کے لیے آتا ہے۔اوپر کی آیات میں وعدۂ نصرت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے حوالہ سے مؤیّد کیا ہے۔اس آیت میں اپنی صفات کے ساتھ آفاق کی شہادت بھی شامل کر دی ہے۔مطلب یہ ہے کہ کوئی موجودہ ظاہری حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر خدا کی نصرت کے ظہور کو بعید ازامکان نہ سمجھے۔یہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کی شان کس طرح ظاہر ہو گی اور اس کے ہاتھ کدھر سے نمودار ہوں گے۔زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل خشک اور چٹیل پڑی ہوتی ہے، نہ اس پر سبزہ اور روئیدگی کا کوئی اثر ہوتا اور نہ افق پر کسی جانب ابر کا کوئی نشان، لیکن جب خد چاہتا ہے تو اس کی بھیجی ہوئی ہوائیں بادلوں کے قافلے کے قافلے ہانک کر لاتی اور فضا میں پھیلا دیتی ہیں۔پھر چشم زدن میں ساری زمین جل تھل ہو جاتی ہے اور دیکھتے دیکھتے ہر طرف سبزہ کی بانات بچھ جاتی ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اپنی رحمت و نصرت کی گھٹائیں اپنے ان بندوں کے لیے بھی بھیج دے گا اگرچہ ظاہری حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں۔

'لَطِيفٌ خَبِيرٌ' کی صفات کا حوالہ نہایت لطیف طریقہ سے: 'لَطِيفٌ خَبِيرٌ' کی صفات کا حوالہ یہاں نہایت لطیف طریقہ سے آیا ہے۔'لَطِيفٌ' کے معنی باریک بیں اور دقیقہ رس کے ہیں۔یعنی وہ اپنی تدبیروں کو اس طرح بروئے کار لاتا ہے کہ کسی کو ان کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔وہ بڑی خبر رکھنے والا ہے۔لوگ صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں لیکن وہ ماضی کے پردوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اس سے بھی باخبر ہے اور مستقبل کے اوٹ میں جو کچھ ہے اس سے بھی باخبر ہے۔

لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٦٤﴾

ترجمہ

اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی ہے جو بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

خدا بے ہمہ بھی ہے اور باہمہ بھی: یہ اوپر کے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا اور اسی کے تصرف میں ہے تو اس کے ارادے میں کون مزاحم ہو سکتا ہے؟ وہ سب سے بے نیاز اور اپنی ذات میں مستغنی ہے۔'حمید' کی صفت یہاں بطور بدرقہ ہے یعنی وہ غنی ہونے کے ساتھ 'حمید' بھی ہے۔'حمید' کے معنی ہیں ستودہ صفات اور تمام سزاوار حمد کاموں کا منبع۔اس بدرقہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ خدا کے بے نیاز ہونے کے سبب سے بندوں کے اندر مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ وہ امید رکھیں کہ س کے بے نیاز ہونے کے باوجود خلق کے لیے اس کا فیض ہر وقت جاری ہے۔وہ بے ہمہ ہونے کے ساتھ ساتھ باہمہ بھی ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَن تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٥﴾

ترجمہ:

دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمہاری نفع رسائی میں لگا رکھا ہے زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو بھی، وہ چلتی ہے سمندر میں اس کے حکم سے اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ زمین پر گر پڑے۔ مگر یہ کہ اس کے حکم سے۔بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا ہی مہربان اور بڑا ہی رحیم ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

قریش کے متمردین کے لیے دھمکی: یعنی اس دنیا میں انسان کو جو مہلت ملی ہوئی ہے یہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی عنایت و مہربانی سے ملی ہوئی ہے۔آسمان و زمین کی ہر چیز جو انسان کی خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہے اور جس کے بغیر اس دنیا میں انسان کا بقاء ایک لمحہ کے لیے بھی ممکن نہیں ہے، یہ خدا ہی کے حکم سے لگی ہوئی ہے۔اگر خدا کا حکم نہ ہو تو اس کائنات کی ہر چیز انسان کی باغی اور اس کی دشمن بن جائے۔کشتی ہی کو دیکھ لو یہ خدا ہی کا حکم اور اسی کے قانون کی تسخیر ہے کہ وہ تمہارے لیے سمندر کے سینہ کو چیرتی ہوئی چلتی ہے ورنہ چشم زدن میں سارا بیڑا غرق ہو جائے۔یہ خدا ہی ہے جو آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا وہ تمہارے سروں پر گر پڑے۔'اَنْ' سے پہلے مضاف کے محذوف ہونے کے قاعدے کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ'۔یعنی یہ ساری چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ حاصل ہے یہ اس کے اپنے بل بوتے اور اس کے اپنے علم و سائنس پر مبنی نہیں ہے بلکہ خدا کی رأفت و عنایت پر مبنی ہے۔اگر اللہ تعالیٰ اس نظام کائنات کی ایک اینٹ بھی ذرا سا اس کی جگہ سے کھسکا دے تو ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آرہے۔

ان فقروں کے تیور نگاہ میں رہیں۔ان میں قریش کے متمردین کے لیے جو دھمکی ہے وہ لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔مطلب یہ ہے کہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔اگر عذاب میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام ہے بلکہ یہ صرف ہماری رافت و رحمت کے سبب سے ہے کہ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنے رویہ کی اصلاح کر لو۔

وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ ﴿٦٦﴾

ترجمہ

اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا۔بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

سرکشی کی اصل علت: یہ آخرت کی یاددہانی فرما دی کہ اگر اس دنیا میں عذاب نہ آئے تو یہ کون سی اطمینان کی بات ہے؟ آگے آخرت جو موجود ہے! بالآخر لوٹنا تو سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔خدا ہی نے زندگی بخشی ہے اور وہی موت دیتا ہے۔پھر وہی زندہ اٹھا کھڑا کرے گا۔جب اس کو پہلی مرتبہ پیدا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو آخر دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی! 'اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ' یہ اس ساری سرکشی کی اصل علت بیان ہوئی ہے کہ جہاں تک قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا تعلق ہے وہ تو بالکل واضح ہیں، ان میں کسی بحث و نزاع کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ لوگ نہایت ناشکرے اور ناقدرے ہیں۔لفظ 'انسان' سے اشارہ تو یہاں انہی مخالفین کی طرف ہے لیکن اظہار نفرت کے طور پر بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے عام لفظ سے فرما دی گئی ہے۔اس اسلوب میں اظہار حسرت کا مضمون بھی پایا جاتا ہے جس کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ۚ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾

ترجمہ

اور ہم نے ہر امت کے واسطے ایک طریقہ ٹھہرا دیا ہے تو وہ اسی پر چلیں گے۔تو وہ اس معاملے میں تم سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو۔بے شک تم ہی سیدھی راہ پر ہو۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

لفظ 'منسک' پر آیت 34 میں بحث گزر چکی ہے۔یہاں یہ لفظ طریقۂ عبادت، شریعت کے ظاہری ڈھانچہ اور اس کے قواعد و ضوابط کے لیے آیا ہے۔

مناظرہ بازوں سے گریز کی ہدایت: پیچھے اسی سورہ میں یہ تفصیل بھی گزر چکی ہے کہ اس دور میں یہود اور نصاریٰ بھی کھلم کھلا قریش کا ساتھ دے رہے تھے بلکہ س مناظرہ بازی کو سب سے زیادہ غذا وہی بہم پہنچا رہے تھے۔اس وجہ سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ہر امت کے لیے ایک ضابطہ ٹھہرایا تھا اور مقصود اس سے یہ تھا کہ یہ اس ضابطہ کے مطابق خدا کی عبادت کریں اور جب خداا اس میں کوئی تبدیلی کر دے تو اس کو بھی دل و جان سے قبول کر لیں تاکہ یہ ان کے مخلصین و جامدین میں امتیاز کی کسوٹی ہو۔چنانچہ ہر رسول کے زمانے میں شریعت کے ظاہری ڈھانچہ میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور مبتدعین کی پیدا کردہ بدعتوں کی اصلاح بھی ہوئی۔جن کے اندر حق کی طلب تھی انھوں نے یہ اصلاح صدق دل سے قبول کر لی لیکن جو لکیر کے فقیر اور رسوم و عواید کے پجاری تھے وہ پتھر کی طرح اپنی ضد ہی پر جمے اور اپنی مالوفات کی عصبیت میں حق کے خلاف مناظرہ بازیاں کرتے رہ گئے۔فرمایا کہ یہی حال تمہارے ان مخالفین کا بھی ہے۔یہ بھی اپنے جمود اور جاہلی عصبیت کے سبب سے اس ڈگر کو چھوڑنے والے نہیں ہیں جس پر چلتے آرہے ہیں تو اب ان کے پیچھے زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں ہے 'فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ' یعنی اب ان کو کوئی ایسا موقع نہ دو کہ ان کو تم سے مناظرے کی کوئی راہ ملے۔بس اپنے رب کی جس سیدھی راہ پر تم گامزن ہو اس کی طرف ان کو بھی دعوت دے دو۔اگر وہ آتے ہیں تو فبہا، اگر نہیں آتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔بے شک تم ایک سیدھی راہ پر ہو تو جو سیدھی راہ پر ہے اس کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے کہ دوسرے غلط راہ پر جارہے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون، معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ، قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی پیچھے گزر چکا ہے۔ہم بعض آیات کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں، سورۂ بقرہ میں قبلہ کی بحث کے آخر میں ارشاد ہوا ہے:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ: 148)

"ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرے گا تو تم بھلائیوں کی سمت میں سبقت کرو۔"

سورۂ مائدہ میں فرمایا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (مائدہ: 48)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمہاری آزمائش کرے جو اس نے تم کو بخشی تو بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرو۔"

اظہار رواداری نہیں، بلکہ اعلان بیزاری ہے: مذکورہ بالا آیات کی تفسیر پر، ایک نظر ڈال لیجیے۔ہم نے ان آیات کے تحت یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ رواداری کی ہدایت نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ ان کے رویہ سے بیزاری کا اظہار و اعلان ہے۔

وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾

ترجمہ

اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اس چیز کا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یعنی جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم اپنی طرف سے ان کو کسی بحث و مناظرہ کا موقع نہ دو۔لیکن تمہارے اس رویہ کے باوجود اگر وہ مناظرہ کے لیے آہی دھمکیں تو بس ان کو یہ کہہ کر دفع کرنے کی کوشش کرو کہ اللہ ہمارے اور تمہارے اس اختلاف کا فیصلہ قیامت کے دن فرمائے گا۔جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔مطلب یہ ہے کہ اب ان کو زیادہ منہ نہ لگاؤ بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔یہ جو کچھ کر رہے ہیں، جان بوجھ کر محض شرارت کی وجہ سے کر رہے ہیں۔یہ دلیلوں سے قائل ہونے والے اسامی نہیں ہیں۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧٠﴾

ترجمہ

کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ اس کو جانتا ہے۔یہ سب چیزیں ایک رجسٹر میں درج ہیں۔بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت ہی آسان ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

خطاب پیغمبرؐ سے عتاب مخالفین پر: اس آیت میں اگرچہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس کے لفظ لفظ میں جو عتاب ہے اس کا رخ تمام تر مخالفین کی طرف ہے۔فرمایا کہ کیا نہیں جانتے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے خدا سب سے باخبر ہے تو اب ان اشرار کے معاملہ کو اللہ ہی کے حوالہ کرو، وہی ان سے نمٹے گا!

'اِنَّ ذٰلِکَ فِیۡ کِتٰبٍ' سابق جملے کی دھمکی اس میں اور زیادہ تیز ہوگئی ہے۔یعنی کوئی نہ سمجھے کہ یہ محض ہوئی باتیں ہیں بلکہ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا نے ہر شخص کا سارا ریکارڈ، پورے اہتمام کے ساتھ، ایک دفتر میں محفوظ کر رکھا ہے۔'اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ' اور کوئی اس مغالطہ میں بھی نہ رہے کہ بھلا ایک ایک فرد اور ایک ایک جزئیہ کی تفصیل کون محفوظ رکھ سکتاہے۔دوسروں کے لیے تو یہ کام بے شک ناممکن ہے لیکن اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُم بِهِ عِلْمٌ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ﴿٧١﴾

ترجمہ

اور یہ اللہ کے ماسوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ ان کے بارے میں ان کو کوئی علم ہی ہے۔اور ان ظالموں کا کوئی مددگار بننے والا نہیں ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

ایک اور غلط فہمی کا ازالہ: یہ ایک اور غلط فہمی بھی رفع فرما دی کہ جس دن خدا انصاف کے لیے بیٹھے گا تو اس دن کوئی ان ظالموں کا مددگار نہ بن سکے گا۔ جن چیزوں کو انھوں نے خدا کا شریک و شفیع بنا رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے نہ خدا نے ان کے حق میں کوئی پروانہ جاری کیا ہے کہ وہ اس کی خدائی میں شریک ہیں اور نہ ان کے اپنے ہی پاس ان کے باب میں کوئی علم ہے۔ خدا کے اذن کے بدوں کسی کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ خدا نے اس کو اپنا شریک بنایا ہے اللہ پر افتراء ہے جو ایک جرم عظیم ہے اور جس چیز کے بارے میں کوئی عقلی و فطری دلیل نہیں ہے اس کو معبود بنانا محض ظن کی پیروی ہے اور ظن علم اور حق کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنكَرَ ۖ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۗ قُلْ أَفَأُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكُمُ ۗ النَّارُ وَعَدَهَا اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٧٢﴾

ترجمہ

اور جب ہماری واضح آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم ان کافروں کے چہروں پر ناگواری پاتے ہو۔ گویا یہ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں گے جو ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں اس سے بڑھ کر ناگوار چیز کی خبر نہ سناؤں؟ وہ ہے دوزخ! اس کا اللہ نے ان لوگوں کے لیے وعدہ کر رکھا ہے جنھوں نے کفر کیا ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'سطا ، یسطو' کے معنی حملہ کر دینے اور پل پڑنے کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان معبودوں کے حق میں کوئی دلیل ان کے پاس اگرچہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کے لیے ان کی حمیت کا حال یہ ہے کہ جب توحید کے حق میں ان کو نہایت واضح اور مدلل آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، ان کے چہرے بگڑ جاتے اور بھویں تن جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی آیتیں سنانے والوں پر پل پڑیں گے۔ فرمایا کہ اگر اللہ کی آیات اور ان کے سنانے والوں سے یہ ایسے ہی چراغ پا ہوتے ہیں تو ان سے

کہو کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز کی خبر دوں جو ان چیزوں سے کہیں زیادہ تمہارے چہروں کو بگاڑنے والی ہو گی اور اس سے لازماً تمہیں سابقہ پیش آنا ہے! وہ ہے دوزخ کی آگ!! اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ﴿٧٣﴾

ترجمہ

اے لوگو! ایک تمثیل بیان کی جاتی ہے تواس کو توجہ سے سنو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتوان!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اصنام کی بے حقیقتی کی تمثیل اور ان کے حامیوں کو جواب: یعنی جب تم اپنے معبودوں کی بے حقیقتی کا بیان سن کر ایسے ہی چڑتے ہو تو آؤ ان کی بے بسی کی ایک حقیقت افروز تمثیل سن لو۔ تمہارے سارے دیوی دیوتا، جن کو تم پکارتے ہو، اگر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں پیدا کر سکتے اگرچہ اس کے لیے سب مل کر اپنا پورا زور صرف کرڈالیں۔ اور یہی نہیں کہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ ان کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ جو حلوا تم ان کے آگے پیش کرتے ہو اگر اس میں سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو یہ اس کو بھی نہیں بچا سکتے! طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!!

'ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ' میں نہایت لطیف و بلیغ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ انسان کسی کو معبود مانتا ہے تو اس وجہ سے مانتا ہے کہ اس سے اس کے ضعف و ناتوانی کا مداوا ہوتا ہے لیکن ان نادانوں نے اپنا معبود ان کو بنایا ہے جو ان سے بھی بڑھ کر عاجز و بے بس ہیں۔ یہ اپنی خستگی کی داد ان سے چاہتے ہیں جو بے چارے اپنے چہرے سے مکھی بھی ہانک سکنے پر قادر نہیں ہیں۔

مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٧٤﴾

ترجمہ

انھوں نے اللہ کی، جیسا کہ اس کا حق ہے، قدر نہیں پہچانی! بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

انھوں نے خدا کی شان اور اس کی عظمت و قدرت بالکل نہیں پہچانی۔ خدا ان کے معبودوں کی طرح کوئی عاجز و بے بس ہستی نہیں ہے بلکہ وہ نہایت ہی طاقت ور اور غالب ہستی ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے اس کو پورا کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے اور مجال نہیں ہے کہ کوئی اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٧٥﴾

ترجمہ

اللہ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر چنتا ہے جس طرح انسانوں میں سے چنتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

فرشتوں کی حیثیت: یعنی ان نادانوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر جو ان کی پوجا شروع کر رکھی ہے، یہ محض ان کی سفاہت اور خدا کی شان سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں ار اس کے شریک و سہیم نہیں ہیں بلکہ اس کے بندے ہیں۔ اگر ان کو کوئی مرتبہ حاصل ہے تو یہ ہے کہ جس طرح وہ انسانوں میں سے خاص خاص بندوں کو اپنا پیغمبر بناتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں میں سے اپنے خاص خاص بندوں کو اپنے پیغمبروں کے پاس اپنا قاصد بنا کر بھیجتا ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ' سے بیک وقت دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ایک اس طرف کہ جو خدا خود سمیع و بصیر ہے، سب کچھ سننے او ردیکھنے والا ہے اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔دوسرا اس طرف کہ جب خدا سمیع و بصیر ہے تو وہ ان فرشتوں کے فرائض کی بھی ہر قدم پر نگرانی کر رہا ہے، مجال نہیں کہ وہ سرمو اس کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہو سکیں۔

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۷۶﴾

ترجمہ

وہ جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے۔اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات لوٹتے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

ان فرشتوں کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے سب خدا کے علم کے احاطہ میں ہے اس وجہ سے نہ وہ خدا کے علم میں کوئی اضافہ کر سکتے، نہ ان کا کوئی قول و فعل خدا کی نگرانی سے بالاتر ہو سکتا اور نہ وہ کسی کے باب میں خدا سے یہ کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ ان کو اس کے بارے میں علم ہے، خدا کو نہیں ہے۔سارے امور خدا ہی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔نہ ان فرشتوں کے آگے پیش ہوتے ہیں، نہ پیش ہوں گے۔خود ان فرشتوں کو جو امور تفویض ہوتے ہیں ان کی رپورٹ بھی خدا ہی کے حضور ان کو پیش کرنی ہوتی ہے۔

آگے کا مضمون ـــــ آیات ۷۷ - ۷۸

یہ خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اوپر آپ نے دیکھ لیا کہ کفارِ قریش کو غدار اور خائن ثابت کر کے وراثتِ ابراہیمی اور تولیتِ بیت اللہ کے لیے ان کو بالکل نااہل قرار دے دیا اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس کی تولیت کے اصلی حقدار یہ مسلمان ہیں جو وہاں سے نکالے

گئے ہیں اور کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ بیت اللہ کی آزادی اور تطہیر کے لیے جہاد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اب آگے کی آیات میں مسلمانوں کو وہ ہدایات دی جارہی ہیں جو اس عظیم ذمہ داری کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں —— آیات ملاحظہ فرمایئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۩ ﴿٧٧﴾

ترجمہ

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ (سجدہ)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مسلمانوں کے منصب امامت کے تقاضے: اوپر ہم نے اشارہ کیا کہ یہ اس منصب امامت کے تقاضے بیان ہو رہے ہیں جس کی اس سورہ میں بشارت دی گئی ہے۔ یہ منصب ایک عظیم سرفرازی بھی ہے اور ایک عظیم ذمہ داری بھی۔ اس وجہ سے سب سے پہلے رکوع و سجود کا حکم ہوا۔ رکوع و سجود نماز کی تعبیر ہے۔ لیکن ہم توبہ 112 کے تحت اشارہ کر چکے ہیں کہ ان لفظوں سے جب نماز کی تعبیر کی جاتی ہے تو اس سے صرف موقت نمازیں ہی مراد نہیں ہوتیں بلکہ یہ نمازوں کے اندر شغف و انہماک کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور خاص طور پر ان سے تہجد کی نمازیں مراد ہوتی ہیں جن کا اہتمام عظیم ذمہ داریوں کا اہل بننے کے لیے ضروری ہے۔ یہ موقع، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرفرازی اور ذمہ داری دونوں کا ہے اس وجہ سے شکر گزاری کے پہلو سے بھی نماز کی ہدایت ہوئی اور آنے والی ذمہ داری کا اہل بننے کے پہلو سے بھی۔ یہاں اسی سورہ کی آیت 41 پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جس میں مسلمانوں یہ بتایا گیا ہے کہ حرم کی تولیت کے لوازم کیا ہیں اور ان سے ان کا رب ان کو اس منصب پر سرفراز کرنے کے بعد کیا توقع رکھتا ہے۔

'وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ' یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے اور 'عبادت' جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، اطاعت کے مفہوم پر بھی متضمن ہے۔ یعنی زندگی کے سارے گوشوں میں خدا ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت کرو۔

'وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ' یہ اس سے بھی زیادہ عام ہے۔یعنی مزید نیکیاں اور بھلائیاں بھی کرو۔یہ ان نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا درجہ اگرچہ فرائض و اوامر کا نہیں ہے لیکن وہ فضائل و مکارم میں داخل ہیں اور زندگی کے سنوارنے میں ان کو بڑا دخل ہے۔

'لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ' یعنی ان کاموں کا اہتمام کرو تو اس سے اس تمکن فی الارض کی صلاحیت بھی تمہارے اندر ابھرے گی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے اور آخرت کی بازی جیتنے کی اہلیت بھی تم میں پیدا ہو گی۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٧٨﴾

ترجمہ

اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔اسی نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔تمہارے باپ۔۔۔ابراہیمؑ۔۔۔کی ملت کو تمہارے لیے پسند فرمایا۔اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے۔ اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلم ہے۔تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو۔اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور للہ کو مضبوط پکڑو۔وہی تمہارا مرجع اور کیا ہی خوب مرجع اور کیا ہی خوب مددگار ہے!!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

روحانی تیاری کے ساتھ عملی جدوجہد کی ہدایت: 'وَجَاهِدُوۡا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ'۔ اوپر کی اخلاقی و روحانی تیاری کے ساتھ ساتھ یہ پورے تن من دھن کے ساتھ عملی جدوجہد کی ہدایت ہوئی۔جہاد سے مراد یہاں قتال نہیں ہے۔وہ مشروط بشرائط و حالات ہے۔اس کا ذکر آیات 41-38 میں گزر چکاہے۔یہاں اس سے مراد ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے بندے کے امکان میں ہو۔

'فِي اللّٰهِ' میں مضاف محذوف ہے۔یعنی 'فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ' اور 'حَقَّ جِهَادِهٖ' سے مقصود یہ تنبیہ ہے کہ یہ جدوجہد نیم دلی اور کمزوری کے ساتھ مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کے لیے جی جان کی بازی لگا دی جائے۔

'هُوَاجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ'۔یعنی جو خداتم سے اس جہاد کا مطالبہ کر رہا ہے وہی ہے جس نے اپنے دین کامل کی عظیم امانت کا حامل بنانے کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔'انتخاب کیا ہے' یعنی دوسروں کو 'خواہ قریش ہوں یا یہود' معزول کرکے انتخاب کیا ہے تواس انتخاب کی لاج رکھو اور قوموں کی امامت کے اس منصب کی ذمہ داریوں کو پورے عزم و جزم کے ساتھ سنبھالو۔'وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ'۔یعنی اس دین میں تمہارے اوپرا س طرح کی قیدیں اور پابندیاں نہیں ہیں، جیسی کہ یہود کے دین میں تھیں۔اللہ نے اپنے فضل سے اس دین فطرت کو اس قسم کی پابندیوں سے محفوظ رکھا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ہر چند یہ بار ہے توعظیم لیکن ایسا نہیں ہے کہ تم اس کو اٹھا نہ سکو۔

'مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ'۔یعنی یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی ملت ہے تو باپ کی ملت سے زیادہ اولادع کے لیے اور کون سے ملت مطلوب و محبوب ہو سکتی ہے! یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں اصل خطاب بنی اسمٰعیلؑ سے ہے جو نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے بلکہ ان کو ان کی اولاد ہونے پر بڑا فخر و ناز بھی تھا۔'مِلَّةَ' سے پہلے 'وَاتَّبِعُوْا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل بھی محذوف مان سکتے ہیں اور 'اِجْتَبٰىكُمْ' کو کسی ایسے فعل پر متضمن بھی مان سکتے ہیں جو موقع سے مناسبت رکھنے والا ہو۔میں نے مائدہ کی آیت 2 'وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا' کو پیش نظر رکھ کر تضمین مانی ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی طرف اشارہ: 'هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا'۔یہ اس دین کے ملت ابراہیمؑ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں جنھوں نے تمہارا نام اس سے پہلے مسلم رکھا اور پھر وہی نام تمہارے لیے اس دین میں بھی اختیار کیا گیا۔بعض لوگوں نے 'هُوَ' کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے لیکن میرے نزدیک یہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو بقرہ میں یوں وارد ہے:

'رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ'۔129

(اے ہمارے رب تو ہم دونوں کو مسلم بنا اور ہماری ذریت میں سے ایک امت مسلمہ برپا کر)

مقصود اس نام اور اس دعا کی طرف اشارہ کرنے سے مسلمانوں کی ہمت افزائی ہے کہ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مظہر ہو۔اپنی اس تاریخ کو برابر یاد رکھو! اس سے یہ غلط فہمی کسی کو نہ ہو کہ اسلام یا مسلم کا لفظ سب سے اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے استعمال فرمایا۔اسلام تو تمام کائنات کی فطرت ہے۔'وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' (آل عمران۔82) اور تمام انبیاء کا دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔البتہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی ذریت سے ایک امت کے پیدا ہونے کی دعا فرمائی تھی اور اس کا نام انھوں نے پہلے ہی سے امت مسلمہ رکھا تھا چنانچہ جب اس امت کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسی نام سے اس امت کو موسوم فرمایا۔

'لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'۔بعینہٖ یہی مضمون بقرہ آیت 142 میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا'

(اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی امت بنایا جو وسط شاہراہ پر قائم ہے تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے)

یہ اس انتخاب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے تمہارا انتخاب سب کو معزول کر کے اس لیے فرمایا ہے کہ جس طرح اللہ کا رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اسی طرح اب تم قیامت تک خلق پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو۔یہی تمہارے وجود کا مقصد اور تمہارے اصطفار و اجتباء کی غایت ہے۔اس شہادت کے مقتضیات پر ہم بقرہ 143 کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔

نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت شہادت علی الناس کی ذمہ داری کے پہلو سے: 'فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ'۔ اوپر والی آیت میں نماز ہی سے بات کا آغاز ہوا تھا اور اس کا پہلو ہم واضح کر چکے ہیں۔اب یہ نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کی ہدایت ہی پر سورہ ختم ہو رہی ہے۔یہاں نماز و زکوٰۃ کے اس اہتمام کی ہدایت شہادت علی الناس کی اس ذمہ داری کے پہلو سے ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے۔انھی دو ستونوں پر، جیسا کہ تفسیر سورۂ بقرہ فصل 29 میں ہم واضح کر چکے ہیں، پورے دین کی عمارت قائم ہے اس وجہ سے جب تک ان کا اہتمام باقی رہے گا دین باقی رہے گا۔اگر ان کا اہتمام ختم ہو جائے گا تو دین بھی منہدم ہو جائے گا۔

شہادت حق کی راہ کا بدرقہ: 'وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ' اور 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ بِاللّٰهِ' کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ان مشکلات کا مداوا بتایا گیا ہے جو شہادت حق کی راہ میں پیش آئیں گی۔ فرمایا کہ پورے عزم و جزم کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہو، اپنے رب کو یاد رکھو، اس کی کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور اس کی مدد و نصرت پر پورا بھروسہ رکھو، وہ بہترین مرجع اور بہترین مدد گار ہے!!

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَ اٰخرُ دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

رحمٰن آباد

۶جولائی ۱۹۷۳

The Message of Quran

www.facebook.com/payamequran